ایشیا

ریکارڈ نمبر ۱۶۵۰۱

حضرت ساغر نظامی کی مقبول ترین شاہکار نظم جو انہوں نے خود اپنی درد بھری مست اور جاذب آواز میں ریکارڈ کی ہے

ہمیں مسرت ہے کہ شائقین کرام کی خدمت میں ہیں ایک بالکل انوکھی چیز پیش کرنیکا فخر حاصل ہے۔ ریکارڈ کیا ہے موسیقی و شعریت کا ایک اچھوتا مرقع ہے جس میں ایک شاعر کے دلچسپ جذبات کو اس کی اپنی ہی جاذب آواز نے ادا کیا ہے اور شاعر بھی کون؟ جناب ساغر نظامی۔ جو کہ اپنے تخیّل کی بلندی الفاظ کی شیرینی اور آواز کی ترنّم جاذبیت کے سبب ہندوستان کے شعراء میں ایک ممتاز ترین حیثیت رکھتے ہیں۔

جناب ساغر نے اس ریکارڈ پر اپنی دلکش ترین نظم "پجارن" کو پیش کیا ہے۔ جوں جوں وہ اپنی جذبات میں ڈوبی مترنم آواز سے اس محبوب نظم کو ادا کرتے جاتے ہیں سامعین کے دل پر ایک حسین تصویر نقش ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور دل یہی چاہتا ہے کہ اس دلفریب چیز کو سُنتے ہی جائیں۔ واقعی یہ نادر ریکارڈ بار بار سُننے کے قابل ہے۔

"ہز ماسٹرس وائس"

(سنہ ۱۹۳۵ء میں جاری ہوا)

ادبی مرکز میرٹھ کا علمی و ادبی ماہنامہ

ایشیا

منظور شدہ

محکمۂ تعلیمات، حکومت صوبۂ متحدہ،

حکومتِ بہار، حکومتِ سی پی اور حکومتِ صوبۂ پنجاب

مرتبہ

ساغر نظامی

ناشر

مکتبہ ساغر ادبی مرکز میرٹھ

قیمت سالانہ مبلغ پانچ روپیہ (ہندوستان سے)
قیمت فی نمبر ۸ آنے

(نمونہ مفت نہیں بھیجا جاتا)

قیمت سالانہ آٹھ روپیہ (دوسرے ملکوں سے)
ایجنسیوں کو ۲۵ فی صدی کمیشن

فہرست مضامین ایشیا جون جولائی سنہ ۱۹۴۲ء

جلد ۶ | جون و جولائی ۱۹۴۲ء | نمبر ۱۱ و ۱۲

سخنہائے گفتنی!

آج کل کسی پرچہ کا زندہ رہنا اگر معجزہ نہیں تو کم از کم یسی ہی کوئی چیز ضرور ہے۔ اس مشکل کو کچھ وہی زیادہ جانتا ہے جو س سے متعلّق ہے۔ اور ہر وقت اس سے دوچار رہتا ہے۔ ان لفاظ سے مدعا یہ نہیں کہ ہم نے آپ کی شکایات کو نظر انداز کرنا چاہا بلکہ یہ کہ ہماری مشکل آپ کی شکایت سے زیادہ ہے۔

اس مرتبہ جون اور جولائی کا مشترکہ نمبر آپ کے ہاتھوں میں پہنچ رہا ہے اور یہ بھی محض کاغذ کی دقّت کی بنا پر نکالا گیا ہے۔ جب پرچہ آپ کے پاس پہنچے گا تو آپ اندازہ لگائینگے کہ سائز کے لحاظ سے پرچہ میں ایک ہلکی سی تبدیلی ہے۔ اور شاید وجہ ہم سے پوچھنے کے بجائے آپ خود ہی جان لیں اور یہ بھی بہت ممکن ہے کہ اگست نمبر کا سائز عام پرچوں کا سا کرنا پڑے۔

کاغذ کے سلسلہ میں دقتیں اُٹھانی پڑ رہی ہیں ان سب کا تذکرہ اگر آپ سے کرنا شروع کیا جائے تو کہا نہیں جا سکتا آپ مستقل مزاجی سے سُن سکیں گے یا نہیں اور تذکرہ ہم کرنا بھی نہیں چاہتے۔ بہت ممکن ہے آپ کی طبیعت بھی ہم ہی جیسی مشکل پسند ہو لیکن اب اس سے کیا حاصل۔ مختصرًا یہ کہ پرچہ کسی نہ کسی طرح آپ تک پہنچا دیا اور آئندہ بھی پہنچاتے رہینگے۔ اس لئے کہ ہمارے پائے استقلال کو ابھی تک کوئی جنبش نہیں ہوئی۔

یوں تو ساری زندگی ہی دُکھ اور پریشانیوں سے معمور ہے لیکن سب سے زیادہ تکلیف دہ زندگی ذمّہ داری کی زندگی ہے

ایک طرف جنگ ہے کہ کسی صورت مفاہمت یا فیصلہ کی صورت اختیار نہیں کرتی۔ نمعلوم وہ انسانیت، تہذیب اور تمدّن کے علمبردار آج اپنا حلم کہاں رکھ کر بھول گئے۔ نمعلوم انہیں کبھی اپنے پُرانے دعووں کا خیال بھی آتا ہے یا نہیں۔ آج ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ تمام تہذیب اور تمدّن ایک حسین بلّی کی مانند جس کی نرم و نازک پوستین کے نیچے بہت تیز ناخن چھپے ہوئے ہیں اور جنہیں وہ آہستہ آہستہ نکالتی جا رہی ہے اس چند سالہ جنگ اور اس کی خاص کر ہولناکیاں دیکھ کر مستقبل تاریک سے تاریک تر نظر آنے لگتا ہے۔ ان توپوں، ہوائی جہازوں اور ٹینکوں کی خونخوار آوازیں سے ایک بھی امید کی شعاع پھوٹتی نظر نہیں آتی۔ انسانی زندگی ایک عجیب کشمکش میں ہے جس کا کوئی تدارک سمجھ میں نہیں آتا۔

اس شمارہ کے مضامین

اس شمارہ کے مضامین پر اگر فردًا فردًا تبصرہ کیا گیا تو یقینًا بہت طویل ہو جائیگا اور آج کل ویسے بھی فرصت کم ہی میسّر آتی ہے۔ مرزا ارشاد بیگ کا مضمون "آنے والی دُنیا کی ایک جھلک" گرمین کے نظریہ کی اضافی شکل ہے۔ اُردو میں ایسے ٹھوس اور سائنسی مضامین کی بڑی کمی ہے اسکے علاوہ اکرام قمر، اکرام حسین، سیّد مظفر حسین برنی اور سراج الدّین آذر کے مضامین اپنی اپنی کاوش اور پہنچ کے لحاظ سے اپنے لئے ایک خاص جگہ کے مالک ہیں۔

علی اطہر کے تراجم آپ اس سے پہلے بھی ایشیا میں دیکھ چکے ہیں۔

آپ کو تراجم میں ایک خاص ملکہ ہے اور ترجمہ برجستہ ہوتا ہے۔ قاضی عبدالغفار کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ "پیش لفظ" کو نہ افسانہ کہا جا سکتا ہے نہ مضمون۔ میری رائے میں پیش لفظ زندگی کی ایک تعریف ہے یا بذات خود زندگی کا ایک جزو۔ "عجیب بات" کالزوردی کے ایک اچھے افسانہ کا ترجمہ ہے۔ یوسف ظفر ہماری بزم میں پہلی دفعہ شامل ہوئے ہیں ایک اچھی چیز کے ساتھ۔

نیا راگ جوش کے بارے میں اظہار خیال کرنا اپنے پڑھنے والوں کو جاہل سمجھنے کے مترادف ہے۔ اختر ہوشیارپوری ایک عرصہ کے بعد ایشیا میں درشن دے رہے ہیں۔ "شکست" کا شاعر بھی اس مجلس میں پہلی ہی مرتبہ آرہا ہے اور اسکے علاوہ اچھی نظمیں اور غزلیں بھی ہیں جو اپنے مضامین، اسلوبِ بیان، الفاظ کے دروبست اور خیالات کے لحاظ سے اچھوتی ہیں۔ (ادارہ)

بریلی، بدایوں اور ایٹہ کے دوستوں سے

انسانی ارادہ کتنا بےبنیاد اور غیر یقینی فعل ہے، تین ماہ سے خیال تھا کہ پھر فقیر کا پھیرا آپ کی نگری تک ہوگا، مگر بجائے یو۔پی کے دورے کے دورے کے، دکن کی جست کامیاب ہوئی۔ آپ تک پہنچنا، یا دوسروں تک پہنچنا، یہ جست، یا وہ جست، غرض باوجود بے پروبالی کے یہ تمام تر اڑان محض زبان و ادب کے اُس مقصد کے لئے جو بظاہر بنیادی اور ضروری معلوم نہیں ہوتا، لیکن انسانی معاشرہ میں اسکی حیثیت قطعی بنیادی ہے۔

میرا آپ تک پہنچنا اور پہنچکر آپ کو متوجہ کرنا یعنی "ہم پکاریں اور کیلئے" کا حادثہ ہونا تعلق کے مثبت ہونے کی دلیل ضرور ہے، مگر میں غالب کا مذاق نہیں رکھتا۔ یعنی ؎

اب نازِ عاشقی کو ہے اُس دن کا انتظار
تم آؤ میرے در پہ تمنا لئے ہوئے ——— !؟

غیرت تو کچھ اور چاہتی ہے، یعنی مقصد لے کر انسان، انسان سے ملنا چھوڑ دے، فرد خود اجتماعی فرائض کو محسوس کرے، میں تو چاہتا تھا کہ آپ اس وقت تک خود ہی ایشیا کی تجدید خریداری فرما دینگے، مگر میعادِ خریداری ختم ہونے کے بعد اس نمبر تک ۶ نمبر آپ کی خدمت میں پہنچ چکے ہیں اور آپ کے استغنا نے کروٹ نہیں لی —— !؟

مجھے بہت کچھ حق ہے، لیکن باوجود کلّی استحقاق اور ضرورت کے ایشیا کی خریداری کو "مجبوری کا سودا" بنانا چاہتا۔ ہاں اس قدر ضرور عرض کروں گا کہ ۶ پرچے پہنچنے کے بعد اب ہر دوست کو زرِ سالانہ خود ہی بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما دینا چاہیئے۔ لیکن جو اصحاب سال بھر کیلئے خریدار نہیں رہنا چاہتے۔ انہیں محض ۶ ماہ کی قیمت تین روپے (سے ۳) جو واجب قیمت ہے بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما کر مرکز کو ممنون فرمانا چاہیئے۔ دھڑکتے ہوئے زمانے اور اس لرزتے ہوئے وقت کا تقاضہ ہے کہ تمام احباب نازک صورتِ حال کو محسوس کریں اور اپنا فرض بجا لائیں۔

ساغر نظامی

اسلام ہاوس حیدر آباد دکن
۲۵ رجون ۱۹۴۲ء

آنے والی دُنیا کی اِک جھلک

حیاتیاتی اور نفسیاتی تحقیق کا اک سلسلہ

ارشاد بیگ

مقالہ نمبر ۱

آنے والی دُنیا کی اِک جھلک

نئے تمدّن کی خصوصیات

مرزا ارشاد بیگ جنکے مضامین اکثر ایشیا میں شائع ہوتے رہے ہیں، زندگی اور اسکے تعلقات پر گہری نظر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو کچھ ہو گیا یا جو کچھ ہو چکا اسکی انہیں اتنی فکر نہیں جتنی اسکی فکر ہے کہ آئندہ کیا ہوگا اور علمی طور پر اسکی کیا تعبیرات ہوتی ہیں یا ہو سکتی ہیں۔ موجودہ دُنیا اِک عجیب و غریب بحران میں غوطہ زن ہے۔ لوگ تبدیلی اور انقلاب کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، مگر اسکی تعبیر نہیں کر سکتے، شاید اس لئے کہ وہ سائنٹفک طور پر حالات کے تجزیہ سے قاصر ہیں، سیاست داں شعراء اور انقلابی ہیرو طوفان کی علامتیں ظاہر کرتے ہیں، مگر ان علامتوں کی بُنیادوں کو نہیں بتاتے، شاید ان کا یہ فریضہ بھی نہیں ہے۔

ارشاد بیگ نے ان فلسفیانہ مسائل پر سات مقالے لکھے ہیں، جن میں مسائلِ حیات کی حیاتیاتی اور نفسیاتی تحقیق کی گئی ہے :-

(۱) آنے والے تمدّن کی خصوصیات (۲) غیر شعوری ارتقاء میں قباحتیں (۳) حیاتیاتی اصول اسلح

(۴) موجودہ ماحول اور نئی ہیئت ذہنی (۵) مغربی فلسفہ اور نئی حیاتیات (۶) قوت کا نیا مفہوم اور استعداد برائے نظامِ نو

(۷) متوازن ذہن عالم

اس سے پہلے دنیا کے مفکرین نے نئی دُنیا کے متعلق اشارے کئے ہیں، ہمارے شعراء نے نئے زمانہ اور نئے نظام کے گیت بھی گائے ہیں، یعنی ہمیں امید اور رجائیت کے گہوارے میں ہلکورے دینے کی مسلسل کوششیں کی گئی ہیں، مگر یہ تمام کوششیں بڑی حد تک مبہم اور تیرہ و تار حدود سے آگے نہیں بڑھ سکی ہیں، اصل میں جب تک ان حقائق اور قوتوں کو نہ بتایا جائیگا جو نئی دُنیا بسانے کی ذمہ دار ہو سکتی ہیں، محض خیالوں میں ایک نئے زمانے کے راگ گانا، کھوکھلی قسم کی رجائیت ہے، موجودہ دباؤ ڈالنے والی دُنیا میں نسلِ انسانی کے رجائی بننے کے امکانات بھی ہیں یا نہیں، وہ معہود اور مقصود رجائیت، جو زندگی کی کشتی کو کھے سکے کس حقیقت میں پوشیدہ ہے!؟ اور اس فردوس کو نوعِ انسان کس طرح پا سکتی ہے۔ ان مقالات میں ارشاد بیگ نے یہ کوشش کی ہے کہ اس فردوس کا پتہ لگایا جائے، کامیابی اور ناکامی کا سوال نہیں، مگر نوعِ انسانی کے ذہن اور قوتِ حیات کے ان تقاضوں کی طرف اشارے کئے گئے ہیں جو "رجائیت" کو خواب کے بجائے حقیقت اور ابہام کے بجائے وضاحت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

دُنیا کے تمام مفکرین اور سیاست داں کہہ رہے ہیں کہ انسانی ذہن اور تحت الشعور میں ایک عظیم تبدیلی کی ضرورت ہے، موجودہ منزل نوعِ انسانی کے ارتقاء کی آخری منزل نہیں ہے۔ نیا ارتقاء اور زندگی کی نئی ہیئت کیا ہوگی؟ یہ تجزیہ کرنا وقت کی اوّلین ضرورت ہے۔ جبتک موجودہ مفکر یہ معلوم نہیں کریگا کہ ذہنی ارتقاء ماحول پر کس طرح نظر انداز ہوتا ہے، کونسی ذہنی تبدیلیاں موجودہ تباہی کی ذمہ دار ہیں، ذہن میں نئے ماحول کی تعمیر کے لئے کتنی اور کیسی صلاحیتیں پیدا ہو چکی ہیں۔ اور وہ صلاحیتیں دُنیا کے مسائل کو کس طرح حل کر سکیں گی، وہ قوت جو ماحول پر قابو حاصل کر سکتی ہے، اُس کی واقعی صورت کیا ہے؟ اور وہ کس کے دستِ قدرت میں ہے۔ ان بھیدوں کو جبتک معلوم نہ کر لیا جائے ہماری تمام ترجد و جہد لاحاصل ہے۔

ارشاد بیگ کے ان مقالات میں انہیں مسائل کی چھان بین کرنے کی کوشش کی گئی ہے، موجودہ بحران اور انسانی ذہن کی خود شعوری ارتقائی سطح کے تعلق کو اجاگر کیا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ موجودہ غلط اور سطحی ذہنیت، انقلاب اور فضول اعتراضات کے استیصال میں ان مقالوں سے مدد ملیگی جن میں زندگی کے موجودہ بکھراؤ، جنگ اور دُنیا کی جدوجہد کو حیاتیاتی حقائق کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے، اُردو پڑھنے والے ان مضامین سے موجودہ صورتِ حال پر اک نئے زاویۂ نگاہ سے نظر ڈال سکیں گے ـــــ کوئی فیصلہ کن دعویٰ نہیں لیکن تاریخ کی نئی رفتار کے تعین میں یہ صفحات غور و فکر کی ترغیب ضرور دیں، یہ کوئی تصوری خاکہ یا اعتقادی بحث نہیں ہے "حیاتیات" کے اصولوں پر ان مقالات کی بُنیاد ہے اس لئے مجھے علم نواز حلقوں میں ان کی کامیابی کا یقین ہے۔

احسان جولائی ۱۹۴۳ء

مصنف کا کہنا ہے کہ انہوں نے حیاتیاتی تحقیق کرنے میں کافی وقت صرف کیا ہے اور ان مقالوں کی اساس حیاتیاتی سائنس کی نئی تحقیق پر ہے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ حقائق قطعی Original ہیں اور تحقیقی حیثیت رکھتے ہیں۔
قوتِ حیات اور ذہن کا تعلق، قوت کا جدید مفہوم، نظریۂ علم، مسئلہ جبر و اختیار، صحیح نظام کے ارتقائی اصول ہیں اور اس قسم کے مسائل کو از سرِ نو حل کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ مصنف کے نزدیک یہ وہی حقائق اور خیالات ہیں جن کی بنیاد پر آئندہ دنیا کی تعمیر ہوگی۔

بہرحال اس موضوع کے ماہرین ان کے اس خیال کی تائید یا تردید کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ اگر ان مقالات پر تنقیدی مضامین آئے تو ایشیا ان مضامین کو بھی شائع کریگا۔
موجودہ اشاعت میں "آنے والے تمدن کی خصوصیات" کے عنوان سے پہلا مقالہ شائع کیا جاتا ہے۔

ساغر

یہ ایک حیرت انگیز واقعہ ہے کہ تاریخ پر دوسرے عناصر کی بجائے حیاتیاتی عناصر غالب آ گئے ہیں۔ اس لئے بننے والی تاریخ حیاتیاتی عمل کی داستان ہوگی۔ نوعِ انسان کا ادراک اور اس کا ذہن ایک خاص حیاتیاتی دور سے گزر رہا ہے۔ ایک نئی شکل اختیار کر رہا ہے۔ آئندہ الامحالہ خود شعوری ہیئتِ ذہن کا نتیجہ ہوگا۔ آج سے قبل تاریخ میں کبھی ذہنِ انسانی نے خود شعوری کے دور میں داخل ہونے کا شرف نہیں حاصل کیا تھا۔ ہمارے حواس، قوتِ حیات، تموّج یا ہیجان اور ذہن نے وہ ارتقائی منازل طے نہیں کی تھیں جن کے طے کرنے کے بعد زندگی میں خود شعوری حاصل ہوتی ہے۔

ذہن اور قوتِ حیات کے حیاتیاتی ارتقائی مدارج

خود شعوری سطحِ دماغی

بلند ترین شعور

قوتِ حیات کے مختلف مظاہر پر قابو

نئی قوتِ حیات کو سیاسی، جنسی، اور ادراکی مظاہرِ حیات پر قابو کے لئے جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ اور ان کی موجودہ ہیئت سے بلند مقام پر پہنچتی ہے۔ جو خود شعوری ہیئتِ ذہنی ہے۔

(3) قوتِ حیات بالمثل سے تصادم۔ قوتِ حیات کا ادراکی پہلو۔

(2) محبت صنفِ لطیف سے تصادم۔ قوتِ حیات اور جنسی تعلق۔

(1) حکومت۔ سیاسی قوت سے تصادم۔ قوتِ حیات کا اجتماعی عمل۔

خود شعوری ہیئتِ ذہنی کا آغاز

قوتِ حیات کا حواس اور دماغ پر تیز عکس نتیجہ۔ خوشی آ گئے

(ج)

غیر شعوری سطحِ دماغی کا انتہائی نقطہ

حدِ فنا (ب) تا حال ادراک اس سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔

نوعِ انسان کی تحت الشعوری سمجھ کا غیر شعوری ارتقا

غیر شعوری ارتقا کا اولین نقطہ۔ ابتدائی انسان کا ذہن

(ا)

ذہنِ انسانی کی حیاتیاتی ترتیب و تکمیل کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے۔ کہ ا سے ب تک تا حال تاریخ کی جد و جہد غیر شعوری جد و جہد تھی۔ ہم قوتِ حیات کی رو میں بہتے تو تھے لیکن اس کا جائزہ نہیں لے سکتے تھے۔ کیونکہ ہمارے ذہن نے شعوری درجہ حاصل نہیں کیا تھا۔ اس لئے ادراک میں تخیلی عنصر کا دخل رہتا تھا۔ کیونکہ عقل ہمیشہ تمام پہلوؤں کو اپنی گرفت میں لینا چاہتی تھی۔ اور تمام پہلو ابھی ادراک کے پردہ پر نہیں آئے تھے۔ حیاتیاتی ارتقا ہمارے ذہن کو آہستہ آہستہ اس طرح تکمیل و ترتیب دے رہا تھا کہ بالآخر شعوری درجے تک پہنچ جائے۔ جب تک شعوری درجہ حاصل نہیں ہوتا عقل کی تمام پرواز نامکمل رہتی ہے اور تخیلی عنصر کے دخل سے آزاد نہیں ہو سکتی۔ اس لئے مسائلِ عالم کا حل اور حقیقت کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ جب تک قوتِ حیات خود انسان کے ذہن میں ظہور پذیر نہ ہو جائے۔ اس سے متعلق مسائل کو صرف تخیل اور نامکمل حقائق کی بنا پر حل نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ سمجھا جا سکتا ہے۔ ابتک جسے عقل کہا گیا ہے وہ نامکمل اور غیر شعوری قوتِ حیات کے ادراک کا پھیلاؤ ہے یعنی قوتِ حیات کی عدمِ تکمیل سے جو خلا ذہن میں رہ جاتا ہے اسے تخیل کے ذریعہ پُر کیا جاتا ہے۔

ذہن کی صلاحیت

ج

خلا

ب

اٹھارہ جون ۱۹۴۳ء
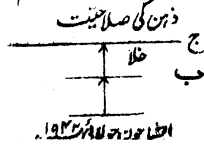
قوّتِ حیات نے "ب" تک ذہن میں ارتقائی سطح طے کی ہے۔ اور اسکی وجہ سے "ب" تک نئے حقوق معلوم ہو گئے ہیں۔ "ب" سے "ج" تک کے نئے حقائق ابھی ادراک سے پوشیدہ ہیں۔ لیکن عقل "ب" تک کے ارتقائی عمل کو "کل" کی طرح برتتی ہے۔ یعنی "ج" تک سوچتی ہے لیکن زندگی کے تمام مناظر کو "ب" کی آنکھ سے ہی دیکھ سکتی ہے۔ "ب" خود نامکمل ہے اور ذہن کی ارتقائی سطح کا ایک تدریجی نقطہ ہے۔ جبتک "ج" کے درجہ تک قوّتِ حیات نہ پہنچے۔ قوّتِ حیات کو ذہن میں شعوری درجہ حاصل نہ ہوگا۔ اور "ب" اور "ج" میں خلا رہیگا۔ اس خلا کو جبتک قوّتِ حیات کا ارتقا پورا نہ کرلے۔ صرف نامکمل عقل کے ذریعہ تخیّل کی مدد سے مسئلہ حیات کو حل نہیں کیا جاسکتا۔ گویا عقل ابھی نامکمل ہے اور تخیّل کے عنصر سے خالی نہیں ہے۔

قوّتِ حیات نے چونکہ ہمارے ذہنی قویٰ میں تکمیل کے مدارج طے نہیں کئے تھے۔ اس لئے عدمِ تکمیل کا لازمی نتیجہ نقص۔ حیوانیت۔ تخیّل پرستی۔ بیکار دلیل بازی کے سوائے کیا ہوسکتا تھا۔ کیونکہ بغیر خود شعوری ذہن کے حقیقت۔ حق۔ اور صحیح نظامِ حیات کا فیصلہ کیسے ہوسکتا ہے۔ لیکن آنے والے تمدّن میں روح و قوّتِ حیات کی شعوری سطح کے بعد اس کا وجود پوشیدہ یا مخفی نہیں رہے گا۔ اور یہی قوّتِ حیات کا عملی ثبوت ہوگا۔ حیاتیات کے جدید اصولوں نے (Vitalism) اور (Mechanism) کے مسئلہ کو بالکل حل کرلیا ہے۔ آنیوالے تمدّن میں ذہنِ انسانی کو بے سروپا اور تخیّلی مسائل میں اُلجھنا نہیں پڑیگا۔ اور اس طرح غلط سوالات اور مسائل میں ہماری ذہنی قوّتیں ضائع نہیں ہونگی۔ آنے والے نظام کے حل کو قوّتِ حیات پر مکمل قابو ہوگا۔ اور یہ حیرت انگیز حقیقت طبعی سائنس کے بھاپ اور بجلی پر قابو پانے سے زیادہ تعجب خیز اور ہماری زندگی کو مالامال کردینے والی ثابت ہوگی۔

دوسری حقیقت یہ کہ موت کا حجاب اُٹھا دیا جائیگا اور انسان دائمی بقا کے دور میں داخل ہوجائیگا۔ موت تو ہوگی۔ لیکن حجاب باقی نہ رہے گا اور انسان موت کو ایک معمولی عمل خیال کریگا۔

تقدیر۔ اور اسرار۔ اور حجابات کی گتھی وا ہوجائے گی۔ حوادث و خطرات زندگی سے تقریبًا مفقود ہوجائیں گے۔ حیوانی جبلیں اور طریقے مٹ جائینگے آنیوالے نظام میں ہماری قوّتِ حیات تکمیل کی صورت میں ظہور پذیر ہوگی۔ اس لئے ہماری خواہشات کچل نہیں جائیں گی۔ بلکہ صحیح طور پر تسکین حاصل کریں گی۔ انسان کے تمام جذبات اور آرزوئیں ایسی مطمئن اور مخمور ہوں گی۔ گویا ہر تار مضراب کی زد سے صحیح سُر چھیڑ کر ایک مکمل نغمہ سے ہم آہنگ ہوگا۔ اور صحیح معنی میں انسانیت کے دور کا آغاز ہوگا۔

لنگڑے لولے اور اندھوں کی پیدائش بند ہوجائیگی۔ کیونکہ آنیوالے دور میں حیاتیاتی ارتقا صحیح ارتقا صحیح نظم اختیار کرلیگا۔ تمام حیاتیاتی نقائص دور ہوجائینگے۔ آنیوالا نظام ایک حیاتیاتی انقلاب ہے۔ جلد ہی نوعِ انسان کو حیاتیات کے ایک نئے دور میں داخل ہونا ہے۔ اس وقت تمام دُنیا کے سامنے یہی مسئلہ ہے کہ آج نوعِ انسان شعوری طریقہ حیات حاصل کرلے۔ قومیت نسل۔ مذہب۔ برتری اور ترقی کے تمام غلط تصوّرات تبدیل ہوجائینگے۔ کیونکہ دُنیا کا تمام نظام اور تمام ذہنیت اور ماحول یکسر بدل جائے گا۔ اس لئے ہر قوم کو اپنا مستقبل اور اپنی پوزیشن آنے والے نقشے میں دیکھنی چاہیئے۔ اس وقت تک کا تمام نظام۔ تمام جدو جہد۔ قوم۔ مذہب اور ملک کے تصوّرات۔ نوآبادیات کا حصول، یہ سب قوّتِ حیات کے ارتقائی مدارج کا عبوری نتیجہ تھا۔ وہی قوّتِ حیات اب ہمیں پُر امن شانت اور شائستہ اور عالمگیر نظام کے دروازے پر لے آتی ہے۔ جہاں جنگ نہیں ہوگی۔ حیوانی زندگی۔ کچلی ہوئی آرزوئیں۔ اور جذبات اور بے چین ذہن نہیں ہوگا۔ نامعلوم اور اوجھل قوتوں کا خطرہ۔ موت کی تیرگی اور تاریکی۔ اسرار کا خوف، زندگی سے ناپید ہوجائینگے۔ مغرب میں نوآبادیات کا لالچ اور مشرق میں تصوّری تقدّس اور جنّت کا فریب قوّتِ حیات کی لازوال اور مدہوش کن مسرّات کا بدل ثابت نہیں ہوسکینگے۔ اور نہ ہی نوآبادیات اور مذہب کے تمام تصوّرات آنے والے نظام کی قوّت کو پسپا کرسکتے ہیں۔ حقیقت تخیّل اور افسانہ سے زیادہ شاندار اور باعظمت ہوتی ہے۔ حقیقی نئے نظام میں مادی خوشیاں اور فرد کی ذات کا حقیقی کیف اپنے صحیح و فطری ادب میں افسانوی تصوّرات اور گمراہ طریقوں اور غلط نظریات پر مبنی نظام کی نام نہاد خوشیوں سے زیادہ مطمئن کرنیوالی حیثیات اختیار کرینگے۔

حیاتیاتی ارتقا اور نظامِ عالم

حیاتیاتی ارتقا کے مختلف مدارج کا جائزہ ہمیں زندگی اور نظامِ عالم کی اُن صورتوں سے واقف کردیگا جو اس کرۂ ارض پر اسے اختیار کرنی پڑیں گی۔ حیاتیاتی

ارتقا نے نئی سطح حاصل کرنے کے لئے اوّلین عملِ انقلاب آج مکمل کیا ہے اور زندگی اب ایک شعوری سطح حاصل کرنے والی ہے - بے سروپا تحقیقات اور بیکار تعلیم کا زمانہ مستقبل کی تاریخ میں ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا - اسکے بعد زندگی میں حیاتیاتی نشوونما کی ایسی سطح اُبھرے گی کہ طریقۂ حکومت روئے زمین سے ختم ہو جائے گا اور ہر شخص اپنے معاش کا خود مالک اور کنٹرول کرنے والا ہوگا - تیسرا حیاتیاتی انقلاب زندگی کی بیماریوں سے کلی نجات دلا دیگا - اور بالآخر زندگی لافانی ہو جائے گی - پیدائش اور موت کا چکّر کرۂ ارض پر بند ہو جائے گا - یہ قوّتِ حیات کی معراج اور انتہائی ارتقا کا قیام ہوگا -

نظامِ عالم سے متعلق قوّتِ حیات کی مختلف ارتقائی صورتیں

(۱) قوّتِ حیات کا غیر شعوری ارتقا - کشمکش حیات - قوّتِ حیات کی عدم تکمیل ذہن سے متعلق - قوّتِ حیات اور شعور میں بعد - قیاسی تحقیقات و علم - اور نظامات و تحریکیں -

(2) خود شعوری ارتقا - قوّتِ حیات کا ذہن میں شعوری ظہور - انسانی ادراک کے پیمانہ کی تکمیل - قیاسی علم اور تصوّرات کے زمانہ کا اختتام - صحیح نشوو ارتقا اور ترقی و انکشافات کا آغاز -

(3) حکومت کا اختتام - قوّتِ حیات ایسے ارتقائی مدارج طے کر چکی ہوگی - کہ اس درجہ پر آ کر زندگی کے مزید ارتقا اور اجتماعی تعلقات کو قائم رکھنے کے لئے حکومت کی ضرورت باقی نہیں رہے گی -

(4) بیماریاں کالعدم - قوّتِ حیات کا نشوونما ایسی تشکیل اختیار کرلیگا کہ بیماریاں جاتی رہیں گی - بیماریاں قوّتِ حیات کے انتشار اور جسم کی اسے سہارنے کی عدم صلاحیت کا نتیجہ ہیں -

(5) موت کی موت - قوّتِ حیات اور ہمارا جسم ایک سطح پر آ جائینگے اور جسم لافانی ہو جائے گا - جسم میں قوّتِ مدافعت اور صلاحیت اپنے انتہائی مدارج پر ہوگی -
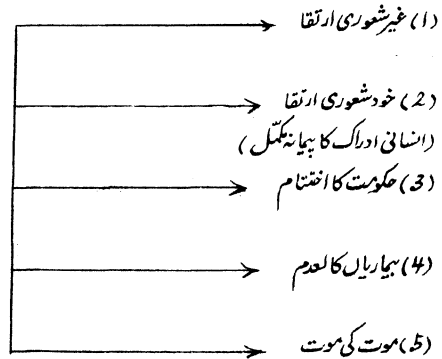
پہلے درجہ سے دوسرے درجہ تک غیر شعوری ارتقا کا عمل ہے اور باقی تمام درجات کا عمل شعوری ارتقا سے متعلق ہے - گویا خود شعوری ار[illegible] جو تاریخ کی رفتار شروع ہوگی - وہ نوعِ انسان کے جسم میں قوّتِ حیات کا ارتقا جو مدارج اختیار کرلے گا اُن کا اثر سماجی نظام - سیاسی خاکوں اور زندگی کے دوسرے طریقوں پر بھی پڑے گا -

موجودہ بُحران - اور قوموں اور دُنیا کے نظاموں کا حیاتیاتی جائزہ

موجودہ دُنیا بے شعوری کی دُنیا ہے - یعنی قوّتِ حیات شعوری حیثیت میں کارفرما نہیں ہے - موجودہ نظام کو قوّتِ حیات پر قابو نہیں ہے - بس چل رہا ہے -

جس کی وجہ سے قتل و خونریزی حرص و آز دُنیا پر چھائے ہوئے ہیں۔ مذاہب نے قوتِ حیات کی شعوری تمیز کے بغیر اعتقادی خیالات میں دُنیا کو اُلجھا دیا۔ اسکے علاوہ جو آزاد خیال افراد ہیں وہ بھی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے۔ کیونکہ قوتِ حیات کی انہیں تمیز نہیں ہوتی۔ اس لئے مسئلہ بھی حل نہیں ہوتا۔ بدیں وجہ موجودہ نظام زندگی کیلئے ایک عذاب بنا ہوا ہے۔ قوتِ حیات کا ارتقائی عمل جسے خود شعوری کی سطح حاصل کرنی ہے۔ قوتِ حیات کو کنٹرول کر رہا ہے۔

انسان کی حیاتیاتی قوتِ حیات کا مختلف مدارج اور اصولوں سے تدریجی سفر

خاکہ

حدِ فنا کے بعد خود شعوری سطحِ ذہن حاصل کرنیکے لئے نئی قوتِ حیات کے عملی مدارج

حدِ فنا

حقیقت

(۱) حکومت

(۲) تجارت

(۳) اولاد

قتل و خونریزی سرمایہ داری

جرائم

آوارگی غلط شعور

نئی قوتِ حیات کو ان تینوں پر کنٹرول کرنا ضروری ہے

(ج) خدا، نبی، پیشوا، رہنما

(ب) گرو دیوتا

(۱) شخصیت

غیر شعوری مدارجِ ذہن

خود شعوری

مابعد حدِ فنا

ماقبل حدِ فنا

مذاہب علمی و خیالی تصورات
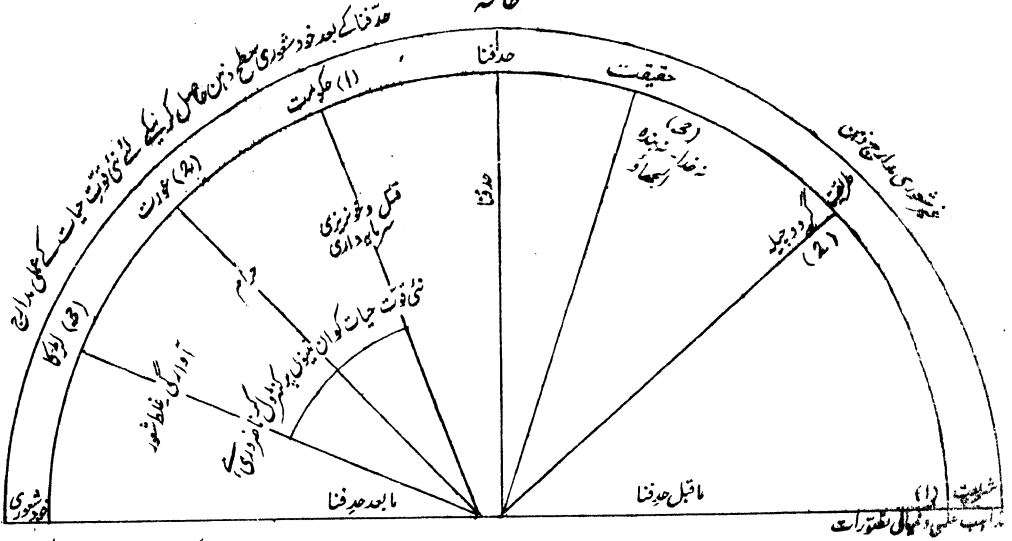
نئی قوتِ حیات کا ← سطحِ ذہن

اطلاق خود شعوری سطحِ ذہنی کے ساتھ

نتیجہ غیر شعوری اور عدم تکمیل پر مبنی قوتِ حیات پر کنٹرول

خاکے میں دُنیا کے موجودہ مسئلہ کو حیاتیات کی روشنی میں بتایا گیا ہے۔ نقطۂ فنا سے قبل انسانی سمجھ تین ارتقائی صورتیں اختیار کرتی ہے۔ یا تو وہ کسی ظنی نظام کے سامنے سر ڈال دیتی ہے اور مذہب کی شریعت سے خود کو وابستہ کر دیتی ہے اور اس طرح زندگی کے مسئلہ کو حل کرنا چاہتی ہے۔ یا اس سے آگے بڑھ کر گرو یا مرشد کے سامنے انسان کا ذہن جھک جاتا ہے۔ اور حق کی تلاش اسکے اتباع کے ذریعہ کرنا چاہتا ہے یا اس سے بھی آگے بڑھنے پر سمجھ خود زندگی کے مسئلہ پر آزادانہ نظر ڈالتی ہے اور خود کو بہت اہمیت دیتی ہے۔ یہاں آکر انسان اپنی ذات کو سب کچھ سمجھتا ہے حتیٰ کہ خود کو خدا تک سمجھنے لگتا ہے۔ لیکن چونکہ قوتِ حیات کا شعور حاصل نہیں ہوتا اس لئے ذہن خود دیوتا بن جاتا ہے اور کوئی راہ نہیں ملتی۔ غیر شعوری سطحِ ذہن کی بلندی کا انتہائی نقطہ حدِ فنا تک ہے۔ اب تک نوع انسان کی جدوجہد اور ارتقا حدِ فنا سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ عام انسان کا ذہن اور ادراک نقطۂ فنا سے پست ہے۔ نقطۂ فنا پر آکر حواس قوتِ حیات کے تیز عکس کی وجہ سے اپنا توازن قائم نہیں رکھ سکتے۔ یہ گویا ادراک کی حدِ موت ہے۔ نقطۂ فنا پر آتے ہی ذہن کو نشوونما کی کوئی راہ نہیں ملتی۔ اس سے آگے ارتقا حاصل کرنے کے لئے ادراک کو حدِ فنا عبور کرنی پڑتی ہے۔ گویا غیر شعوری اور خود شعوری ارتقا کے بیچ میں حدِ موت حائل ہے۔ جہاں حواس قوتِ حیات کی مدافعت میں جواب دیدیتے ہیں۔ جب اس میں قوتِ حیات کا ہیجان تیزی سے ابھرتا ہے تو انسان حواس کا توازن کھو دیتا ہے۔ لیکن آج انسان کا ذہن زیادہ صلاحیت کا حامل ہے۔ اس لئے وہ توازن تو نہیں

آئینہ ملتان جولائی ۱۹۶۴ء

کھوئے گا لیکن اوّل حواس پر خاموشی طاری ہونی لازمی ہے - کیونکہ سمجھ اُبھار حاصل کرتے وقت حواس پر زیادہ دباؤ ڈالتی ہے - خاموشی کے بعد خود شعوری ارتقا کے مدارج شروع ہوتے ہیں - یہاں پہنچکر نئی قوّتِ حیات کو تکمیل حاصل کرنے کے لئے غیر ترقّی یافتہ قوّتِ حیات کی تین عملی صُورتوں کو قابو کرنا ضروری ہے - ورنہ نئی قوّتِ حیات صحیح نظام قائم کرنے سے قاصر رہے گی - خود شعوری حاصل کرنے والے ذہن کو عورت کی محبّت سے تصادم پذیر ہو کر آگے ارتقائی طور پر بڑھنا ہوگا - اور اگر نئی قوّتِ حیات عورت کی جنسی تسکین نہ کر سکے - تو زندگی کے نظام میں نقائص اور خامیاں رہ جائیں گی - اسکے بعد نئی قوّت حیات بالمثل سے ٹکرانا پڑتا ہے - اور یہ حیلیاتی فعل نہایت ہی مشکل اور دشوار ہے - کیونکہ اس عمل میں دونوں کی جنس ایک ہوتی ہے - یہاں جنسی میلان کا سوال پیدا نہیں ہوتا کہ نئی قوّتِ حیات جنسی تسکین کے ذریعہ اسے مفتوح کر سکے - اس لئے قوّتِ حیات کو نہایت ہی ضبط کے ساتھ آگے بڑھنا ہوتا ہے - اگر نئی قوّتِ حیات پسپا ہو جائے تو زندگی کے نظام میں نوع انسان کی سمجھ اور اسکے شعور اور ارادہ پر نئی قوّتِ حیات کا کنٹرول نہ ہو سکے گا - جب نئی قوّتِ حیات اس سے بھی آگے بڑھنے میں کامیاب ہو جائے تو اسے نوعِ انسان کی اس قوّتِ حیات پر پورا قابو حاصل ہو جائے گا جو ابھی خود شعوری کی منازل سے نیچے ہے - اور نقطۂ فنا پر کھڑی ہے - آج تمام نوع انسان نقطۂ فنا پر کھڑی ہوئی فنائیت کی زد میں ہے - وہ اپنے مزید ارتقا اور نشوونما کیلئے جبتک خود شعوری سطح ذہن کا اتباع نہیں کریگی - اس حالت سے نہیں نکل سکے گی - نئی قوّتِ حیات جب قوّتِ حیات بالمثل کو رجوع کر چکتی ہے تو حکومتوں کا نظام بھی متزلزل ہو جاتا ہے - کیونکہ حکومتیں افراد کے اجتماعی شعور کا ہی نتیجہ ہیں - اس لئے نئی قوّتِ حیات کو سیاسی قوّت بھی حاصل ہو تی جائے گی - جب نئی قوّتِ حیات کو حدِّ فنا سے گزرنے کے بعد دُنیا میں پھیلی ہوئی قوّتِ حیات کی ان تین صورتوں پر کنٹرول حاصل ہو جائے گا تو نظامِ عالم سے قتل و خونریزی - جلب منفعت - اور فرد کی قربانی بند ہو جائیگی - حرام - اغلاط - عورتوں کی بدچلنی - اور لڑکوں کی آوارگی و غلط روی ختم ہو جائیگی - کیونکہ انسان کی قوّتِ حیات نئی قوّتِ حیات کی گرفت سے گریز نہیں کر سکے گی - قوّتِ حیات کے غلط انتشار کا نتیجہ یہ نقائص تھے - نئی قوّتِ حیات خود ان درجوں سے آگے بڑھ کر مکمل ہو جائیگی - اور یہ صحت و نظم کا اعلیٰ ترین نمونہ ہو گی - زندگی ایک فردوس ہو گی - ابتک کے تمام نظام میں زبردست قباحت اور نقص تھا - کسی نظام نے ان حیاتیاتی مدارج کو آج تک طے نہیں کیا - جو آنے والا نظام طے کر چکے گا -

مختلف مذاہب نے عالمِ ارواح - جنّت کی زندگی کے تصوّرات ہمارے سامنے پیش کئے - نقطہ فنا سے قبل کا ذہن اگر نقطۂ فنا کے بعد کے مسائل کو گرفت میں لینا چاہے تو سوائے تخیّلی تگ و پو اور ناکامی کے کیا حاصل ہو سکتا ہے - یہی وجہ ہے - کہ مذاہب کا خدا تصوّری خدا ہے - اور مذہب کو زندگی پر قابو نہیں ہے لیکن نئے نظام میں حیاتیاتی ارتقا کے ذریعہ نقطۂ فنا سے گزر کر نوع انسان کی قوّتِ حیات کو عملی مدارج کے ذریعہ گرفت میں لیا جائیگا - اس لئے آنے والے نظام کو زندگی پر قابو حاصل ہوگا - یہ نظام محض اپیل نہیں ہے - بلکہ زندگی کی عملی حقیقت ہے - حیاتیاتی نقطۂ نگاہ سے خدا ایک تصوّر یا زبان سے ادا کرنے کا لفظ ہی نہیں بلکہ ایک قوّت ہے - اور اخلاق ایک وعظ نہیں - بلکہ قوّتِ حیات کے نظم و صحت کا لازمی نتیجہ ہے - یہ محض آرزوؤں کی قربانی اور ترک نہیں بلکہ تسکین اور خواہشات کی تکمیل میں ممد و معاون ہوگا - بیش از بیش گزشتہ نظاموں نے اُس حیات کا جو قوّتِ حیات کو خود شعوری سطح ذہن حاصل کرنے کے بعد ملے گی - تصوّراتی بہشت اور خیالی فردوس کے ذریعہ ایک نعم البدل پیش کیا - نقطۂ فنا سے قبل کے ادراکِ انسانی پر مبنی نظاموں نے دُنیا کی جدوجہد اور نوع انسان کی قوّتِ حیات پر کنٹرول نہیں کیا - بلکہ خام اور نامکمل پروگرام پیش کئے - اسی لئے آج نوع انسان کو تباہی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور اس سے بچنے کیلئے تکمیل یافتہ قوّتِ حیات سے مخالفت کرنا لازمی ہے -

آنے والا نظام قوّتِ حیات کے مزید نشو و ارتقا کے لئے راہ مہیّا کرے گا - اور اس کے لئے عملی مدارج کے ذریعہ اور آگے بڑھنے کے مواقع پیدا ہوں گے - کیونکہ نیا حیاتیاتی نظام خود عملی مدارج ارتقا کے بعد قائم ہوگا - تخیّل یا عدم تکمیل پر مبنی قوّتِ حیات کی بُنیاد پر نہیں -

---
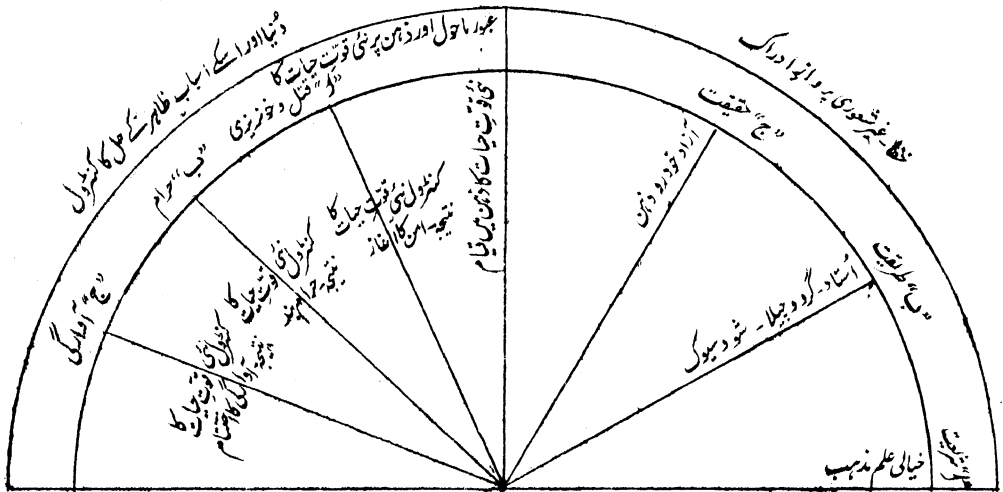
ادراک کا غیر شعوری ارتقا اور مدارج اور دُنیا کے مسائل یہ سب خود شعوری سطح ذہن پر آکر حل ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف مسائل زندگی پر بصورت اعتقادی مذاہب نے نظر ڈالی۔ اور ما اعتقادی طور پر ارتقائی منازل کے حل کو تخیلی اعتقادات کے ذریعہ پورا کرنا چاہا۔ جب زندگی کو خود شعوری حاصل ہو جائے گی تو نئی قوتِ حیات کی رو میں معتقدات خود بہ جائینگے۔ دوسری طرف ادراک نے حیاتیاتی منازل عبور کئے بغیر آزاد ہو دوڑنا شروع کر دیا جس کا نتیجہ تباہی و بربادی ہوا۔ لیکن حیاتیاتی نظام دُنیا کے مسئلہ کو عملی اور ارتقائی منازل سے گزرنے کے بعد اس وقت گرفت میں لینا شروع کرتا ہے۔ جب اسے خود شعوری حاصل ہو جاتی ہے۔ خود شعوری کے حصول میں کامیاب ہونے کے بعد ہر دمی روح پر نئی قوتِ حیات کی گرفت قائم ہو جائے گی۔ یعنی نئی طاقتوں کا کنٹرول شروع ہو جائے گا۔ یہ کنٹرول آج دنیا کی موجودہ جدوجہد پر شروع ہو گیا ہے۔ اور روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ حیاتیات کا اٹل قانون ہے۔

قوموں کی نفسیاتی قباحتیں

مذاہب کو خدا کی تمیز نہیں ہے۔ مذاہب کا خدا تصوراتی خدا ہے۔ حیاتیاتی نقطۂ نگاہ سے موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کا ذہن سب سے زیادہ حقیقت سے دور ہے۔ اس قوم نے حقیقت کے قصے گھڑ لئے۔ ترتیبِ ارتقائے نفس کا غلط راستہ اختیار کیا۔ ہندوؤں نے صحیح راستہ اختیار کرنا تو چاہا۔ لیکن خود شعوری تک نہ پہنچ سکنے کی وجہ سے کوئی راہ نہ پا سکے۔ یورپین قومیں خودرو بلا کنٹرول قتل و خونریزی میں اُلجھ گئیں۔ مسلمانوں کا مولوی۔ عیسائیوں کا بادشاہ اور ہندوؤں کا یوگی زندگی کے عملی اور خود شعوری ارتقائی دائرہ میں بیکار ہو کر رہ گئے۔ کیونکہ اُن میں قوتِ حیات نے خود شعوری سطح ذہن تو حاصل کی ہی نہیں تھی۔ اس سے اُن کو دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ اس لئے تمام مسلمانوں کے مولوی یورپ کے سیاستداں اور ہندوؤں کے مفکر حیاتیاتی نظام کی گرفت میں لئے جا رہے ہیں۔ ہر قوم کی ترقی کی راہ یہی ہے کہ وہ اپنے ارتقائے نفس کیلئے نئی اُبھرتی ہوئی طاقتوں کا اتباع کرلے۔ مسلمانوں کا ظنی علم۔ یورپ کی میکانی قوت اور ہندوؤں کا تخیل خود شعوری سے منسلک طاقتوں کے سامنے بیکار ہے۔

"نفسی اور جسمانی نظام میں تغیر"

ارتقائی نظام کی طرف یعنی خود شعوری ہیئت ذہنی کی طرف اشارہ کرنے والی حقیقت نفسی بعد جسمانی نظام میں تغیر ہے۔ نئی قوتیں ہیں آگے کی طرف

دھکیلتی ہیں اور ہماری ذہنی بلندی موجودہ نظام اور اقدار کو زیادہ صحیح اور جدید خطوط پر دیکھنا چاہتی ہے۔ جب ادراک میں وسعت پیدا ہوتی ہے تو اس سے کم درجہ کی چیزیں مضحکہ انگیز سی معلوم ہونے لگتی ہیں علاوہ ازیں ہمارے احساسات اور ذہن کو غلط تصورات سے اطمینان بھی نصیب نہیں ہوتا۔ کیونکہ زندگی کی عملی کیفیتیں ایک الگ ذہنیت پیدا کرتی ہیں۔ انسانی تصورات اور زندگی کے عملی حقائق کے اس تصادم سے عجیب عجیب اُلجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں جو ذہن کیلئے بیحد تکلیف دہ اور جاں گسل ثابت ہوتی ہیں۔ انسان کو زندگی میں معقولیت - امید - نجات - سچائی - نظم اور اپنی ذات کی نشو و نما کی راہیں کہیں نظر نہیں آتیں - پُرانا شعور اور طریقے زندگی میں کارگر ثابت نہیں ہوتے -
انسان خود کو تنہا - مایوس اور تباہ حال پاتا ہے اور مختلف تاویلیں اس صورتِ حال کی کرکے خود کو مطمئن کرنا چاہتا ہے لیکن سوائے مایوسی کے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا۔ کیونکہ امید، معقولیت - اور ذات کی نشو و نما کے ذرائع تو نیا شعور ہی پیش کرسکتا ہے اس لئے نفس اور ذہنی نظام اس وقت تک منتشر رہتا ہے جبتک اسے صحیح ارتقائی نظام حاصل نہ ہو -

انقلاب کے سابقہ عبوری ادوار اور موجودہ عبوری دور

آج سے قبل جتنے عبوری ادوار تاریخ میں آئے وہ قوّتِ حیات کی غیر شعوری ہیئت اور اسکے نامکمل پہلوؤں کی ارتقائی منازل سے تعلق رکھتے تھے۔ ان عبوری دوروں کی وجہ سے قوّتِ حیات کوئی بالکل نئی شکل و ہیئت اختیار نہیں کرتی تھی یعنی ایک ہی نوعیت کے سادہ اور مسلسل ارتقا کا سلسلہ تھا اور زندگی کوئی نیا حیاتیاتی پلٹا نہیں کھاتی تھی۔ مثلاً نباتات جبتک نباتاتی ہیئت میں ارتقائی منازل طے کریں ان کا ارتقا ایک ہی نوعیت کا کہلائے گا - اور اگر وہ نباتات سے حیوانات کی ارتقائی ہیئت اختیار کرلیں تو یہ ایک نیا حیاتیاتی پلٹا کہلائے گا - انسان کی زندگی جبلتوں اور ہیجانات کے بہاؤ کے زور پر حیوانی ارتقائی ہیئت میں ہی چل رہی تھی ایک اعلیٰ ارتقائی ہستی اختیار نہ کی تھی لیکن موجودہ عبوری دور ہیں یعنی ہماری قوّتِ حیات کو انسانیت کی ایک اعلیٰ ہستی میں منتقل کر رہا ہے -

غیر شعوری سطح ذہن کی انتہا جسکے بعد .... "ی" .... "ی" تک نہ پہنچنے سے قبل ادراک کے پیمانہ میں خلائیں باقی تھیں - ان خلاؤں کے پُر ہونے کے بعد قوّت حیات ایک نئی سطح اختیار کرتی ہے - آج ذہن "ی" تک پہنچ چکا ہے اور وہ نئی ہیئت کا منتظر ہے -

ذہن نئی ہیئت اختیار کرتا ہے -

سابقہ عبوری ادوار ذہن انسانی کو "ی" تک پہنچانے کا ایک ذریعہ تھے -

غیر شعوری ارتقا

خلائیں جو ارتقا پُر کرے گا -

4

3

2

1
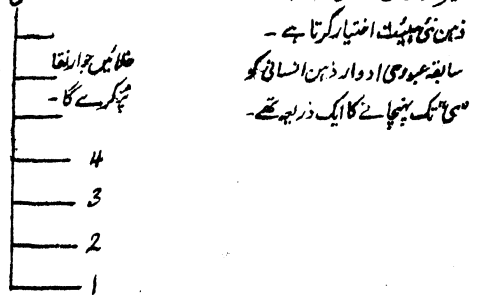
آجتک قوّتِ حیات غیر شعوری منزلوں ہی میں درجہ بدرجہ ترقی پا رہی تھی - لیکن موجودہ دور میں قوّتِ حیات غیر شعوری منازل طے کرنے کے بعد شعوری منزلوں میں داخل ہو چکی ہے -

ج سے شعوری ہیئت میں قوّتِ حیات داخل ہوتی ہے

ا سے ب تک قوت حیات کی غیر شعوری سطح کی حدود ہیں -

د

شعوری ہیئت

ج

ب

غیر شعوری ہیئت

ا
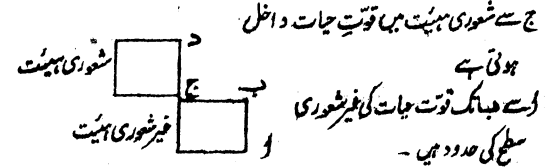
اوّل اوّل پانی سو درجے تک گرم ہوتا ہے اسکے بعد وہ بھاپ بنتا ہے - یہی حال قوّتِ حیات کا ہے - اوّل اوّل وہ غیر شعوری سطح کی ارتقائی منازل طے کرتی ہے اور پھر ایک شعوری ہیئت میں داخل ہوتی ہے - موجودہ عبوری دور اسے سابقہ ہیئت میں ہی آگے بڑھانے کے لئے نہیں ہے - بلکہ اب تو تمام قوّتِ حیات

خودشعوری کی نئی ہیئت اختیار کر رہی ہے ۔اس لئے قوّتِ حیات کے تمام گوشے پوری طرح کھول رہے ہیں۔ ظاہر ہے موجودہ عبوری دور اور سابقہ عبوری ادوار میں زبردست فرق ہے۔کیونکہ تمام قوّتِ حیات اب نشوو ارتقا کی ایک نئی دُنیا میں داخل ہو رہی ہے ۔اگر یہ نئی شکل سے گریز کرنا چاہے تو ساری کی ساری فنا کی زد میں آجاتی ہے ۔ قوّتِ حیات کا کوئی ایک جزو منزلِ تعمیر میں نہیں ہے ۔بلکہ تمام کی تمام تعمیر منزل میں ہے۔غیر ترقی یافتہ ادراک انسانی نئی ہیئت کو اگر قبول نہ کرے تو چونکہ غائیت بلند ہوتی ہے ۔اس لئے پست ادراک اس سے ٹکرا کر واپس لوٹتا ہے ۔اور اپنی ہی ذات پر حملہ کرتا ہے ۔اس عمل سے انسان کی قوتیں خود کو بے بس محسوس کرتی ہیں اور زندگی میں ایک نشیب کی سی حالت پیدا ہوتی ہے ۔انسان کا ادراک نئی ارتقائی حدود سے نیچے جا سکتا ہے ۔ نہ نئی ہیئت کو پھاند کر آگے بڑھ سکتا ہے ۔اور ایک جمود کی حالت موت کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے ۔ایک جانکنی ۔ایک انتشار' ایک نہ رُکنے والا اضطراب' زندگی پر ٹوٹ پڑتا ہے اور نئی ہیئت سے تطابق لازمی اور لابدی بن جاتا ہے ۔ پہلے عبوری ادوار میں چونکہ قوّتِ حیات کوئی ہیئت اختیار نہ کرتی تھی ۔بلکہ ایک بڑھتی ہوئی رَو کی شکل میں چلتی تھی ۔اس لئے غیر ترقی یافتہ ادراک کی کسی ہیئت اور نئی سطح سے ٹکرانے کا مسئلہ ہی پیدا نہ ہوتا تھا ۔اور غیر ترقی یافتہ ادراک پر کنٹرول بھی ہو سکتا تھا۔ سابقہ عبوری ادوار میں انتشار پھیل جاتا تھا۔لیکن ادراک اور قوّتِ حیات کو اس طرح مقید نہیں کیا جا سکتا تھا ۔کیونکہ غیر ترقی یافتہ قوّتِ حیات کو محیط تو ایک نئی سطح اور ہیئت قوّتِ حیات ہی کر سکتی ہے ۔آج نوع انسان پہلی دفعہ اس عمل سے گزر رہی ہے ۔اگر انسان مذہب کی طرف یعنی سچائی اور حقیقت کے ظنّی تصوّرات کی طرف توجّہ کرے ۔اور ان میں گم ہونا چاہے ۔ تو احساسِ گناہ ادراک پر مستقلاً طاری ہو جاتا ہے ۔کیونکہ ادراک عملی طور پر آگے بڑھنے کی راہ تو پا نہیں سکتا ۔ وہ مستقلاً ایک تعطّل کی حالت میں قائم ہے ۔یعنی ادراک کو گریز کے لئے بھی کوئی راہ نہیں ہے ۔اور مذہب نیک و بد اور گناہ و ثواب کے معیار کو ادراک کے سامنے پیش کرتا ہے۔ زندگی خود لغزشوں اور خامیوں کی رہ گزر ہے جبتک صحیح حیاتیاتی نظم قائم نہ ہو۔احساسِ گناہ کی صورت میں مسلسل ایک عذاب کی سی کیفیت کے سوائے ادراک کو کوئی حل نہ ملے گا ۔ یہ بھی ایک حیاتیاتی قانون ہے ۔یعنی جب ادراک مقید ہو اور کسی غلط مکتبِ خیال کا خود ساختہ معیار ہی ہماری ذات کو رد کرتا ہے ۔کیونکہ وہ مکتبِ خیال ادراک کو حیاتیاتی نشو و ارتقا کی راہ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا ۔(حیاتیاتی نشو و ارتقا کی راہ تو نیا حیاتیاتی شعور ہی دے سکتا ہے) یعنی جب ادراک اسیر رہتا ہے ۔ تو ظاہر ہے کہ نشو و ارتقا بھی اسیر ہے ۔ اور یہ قید و بند کا احساس اس خیال میں تبدیل ہو جاتا ہے کہ فرضی مکتبِ خیال کو اچھی طرح نہ نباہنے کا نتیجہ یہ قید و بند ہے ۔اس خیال و احساس کی بنا پر ایک تکلیف دہ کیفیت اور جانکنی ذہن پر چھا جاتی ہے جس سے کوئی مفر نہیں ۔ایک آزاد خیال شخص بھی بغیر خود شعوری حیاتیاتی اور ارتقائی راہوں کے بے بس ہو کر رہ جائے گا ۔اور خود کو پسپا ہوتا ہوا پائے گا۔ یہ حال آج کل تمام تحریکوں کا ہے ۔جنہیں کوئی راہ نہیں ملتی ہے ۔حکومتیں بھی کوئی راہ نہ پاتے ہوئے شکست خوردہ شخص کی طرح ہاتھ پیر ماریں گی اور خود کو کچل ڈالیں گی غرض یہ کہ جبتک ادراک نئی منزل اور نئے خود شعوری ذہن سے تطابق نہ کرلے ۔نشو و ارتقا کی کوئی راہ نہیں مل سکتی ۔آج تمام نوع انسان کو نئی ہیئت ذہنی سے تطابق کرنے کی ضرورت ہے ۔

زندگی اور موجودہ نظامِ عالم کے درمیان ایک علیحدگی پیدا ہو گئی ۔یعنی موجودہ نظامِ عالم میں ہمارے جذبات اور قوّتوں کا کوئی پاس نہیں ہے۔ ہماری زندگی موجودہ محدود نظامِ عالم کے چوکھٹے میں فٹ نہیں ہے ۔ وہ قوّت جو ہمیں متحد اور شیرازہ بند رکھتی ہے خود عبوری حالت میں ہے اور یہ عبوری حالت نوعِ انسان کی تاریخ میں ایک خاص نوعیت رکھتی ہے ۔پہلا مسئلہ ایک ایسا ماحول اور نظام قائم کرنا ہے ۔جو ہماری زندگی کی نئی ارتقائی قوّتوں کو راہ دے سکے اور وہ نظام خود شعوری ہیئت ذہنی کی مدد سے ہی قائم ہو سکتا ہے ۔کیونکہ موجودہ انسان کا ذہن اور ماحول اسی کا مقتضی ہے ۔

موجودہ نظامِ عالم جن قوتوں کی بنا پر قائم ہوا تھا۔ وہ غیر شعوری سطحِ ذہن کے انتہائی نقطۂ ارتقا کا نتیجہ تھیں۔ اب ارتقا آگے بڑھ چکا ہے وہ غیر شعوری سطح ذہن کا کوئی نقطہ تو ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ غیر شعوری سطح ذہن کے انتہائی نقطہ کی بنا پر تو وہ نظام ہی قائم تھا۔ جو اب ٹوٹ رہا ہے۔ اس لئے اب خود شعوری ارتقا کے دور میں زندگی داخل ہو رہی ہے۔ اور موجودہ نظام خود شعوری ارتقا سے متعلق قوتوں کو نہ جذب کر سکتا ہے اور نہ اپنی کوئی راہ دے سکتا ہے۔ اور نہ روک سکتا ہے۔

میں پہلے لکھ چکا ہوں کہ تمام غیر ترقی یافتہ ادراک نئی قوتِ حیات اور خود شعوری ہیئت ذہنی کے جنگل میں مقید ہو گئی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے چراغ کو پشت کی طرف رکھا جائے تو سایہ آنکھوں کے آگے ہی پڑے گا۔ اسی طرح حیاتیاتی اصول ہے۔ جبتک نئی ہیئت ذہنی کو رہبر نہ بنایا جائے گا۔ غیر ترقی یافتہ ادراک پر اس کا سایہ پڑ کر ایک روک بن جائے گا۔

ی .... د ج ب ا
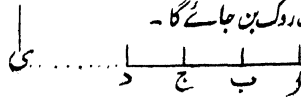
نقطہ ی شعوری ہیئت ذہنی کا نمائندہ ہے۔ جبتک ی کی بنیاد پر نظامِ عالم قائم نہ ہوگا ا ب ج د کے لئے ی ایک روک بنا رہیگا اور ا۔ ب۔ ج۔ د کی قوتیں ی کے بلند درجۂ ذہنی کے سایہ کی وجہ سے مقید رہیں گی۔

پرانے شعور اور ارتقائی قوتوں میں آج ایک زبردست کشمکش بپا ہے۔ پرانا شعور نئی قوتوں کو قابو کرنے میں بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس لئے انسان کا پرانا ادراک بے بسی میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں پرانا نظامِ زندگی کے نئے جذبات اور ہیجانات کی تسکین نہیں کر سکتا۔ اس لئے زندگی بے کسی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ زندگی کی بے بسی اور بے کسی کا علاج نئی قوتوں کی بنا پر ماحول اور ادراک کو بلند کرتا ہے۔ اگر نئے ارتقا سے ہم آہنگ نہ ہوا جائے۔ تو انسان تباہ حال اور بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے۔ جبتک صحیح نظم قایم نہ کیا جائے۔ پرانے شعور اور ارتقائی قوتوں میں اندر ہی اندر ایک کشمکش جاری رہے گی اور زندگی بے چینی اور اضطراب سے نجات نہ پا سکے گی۔

پرانا شعور ← نتیجہ بے بسی ← نئے شعور کی ضرورت
پرانا نظام ← نتیجہ تباہ حالی اور بے کسی ← نئے ماحول کی ضرورت

قوتِ حیات کی نئی شعوری ہیئت کی وجہ سے جسمانی۔ ذہنی اور بیرونی نظم میں تبدیلیاں

خود شعوری ہیئت ذہنی

(جسم)

جسم کی قوتِ مدافعت میں اضافہ۔ ادراک کا پیمانہ مکمل ہو جائے گا۔ قوتِ حیات منتشر حالت میں نہ رہے گی۔ اس لئے صحت میں اضافہ ہوگا جنون اور مجذوبیت کا خاتمہ ہو جائیگا۔ عمر میں اضافہ لازمی نتیجہ ہوگا۔ ذہن کی صلاحیت بڑھ جائیگی۔ ناقص اعضا والوں۔ بہروں۔ اندھوں۔ لولے لنگڑوں کی پیدائش بند ہو جائے گی۔

اعضائے جنسی

جنسی خواہشات کی صحیح تسکین ہوگی۔ اعضائے جنسی میں نقص نہ رہے گا۔ قوت حیات کے نشو و نما سے اعضائے جنسی کی صحت کا زبردست تعلق ہے صحیح نشو و نما یافتہ قوتِ حیات اعضائے جنسی کو بھی صحت اور قوت عطا کرتی ہے اور اس طرح جنسی تعلقات کی شکایات کو دفع کرنے میں مدد معاون ہوتی ہے۔

(ذہن) ———— قوت حیات آزاد اور شعوری حیثیت میں ترقی کرے گی۔ اس لئے ذہن آزاد ذہن آزاد ذہن ہوگا۔ اسرار ختم ہو جائے گا۔ حوادث اور خطرات کا استیصال ہو جائیگا۔ موت کا پردہ ذہن پر وا ہو جائے گا

(خاندانی زندگی) ———— بیوی۔ اولاد اور معاشی ذرائع کی طرف سے کلی اطمینان حاصل ہوگا۔ خود شعوری ترقی کی وجہ سے بیوی اور شوہر میں تصادم اور اولاد کی سرکشی وقوع میں آئے گی۔ صحیح نظام کی وجہ سے معاشی کاوشیں بھی دور ہو جائینگی

(سچائی اور اقرار) ———— مذاہب کا وجود باقی نہ رہے گا۔ عبادت ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ یہ سب خدا تک پہنچنے کا ذریعہ تھے۔ جب خود شعوری حاصل ہو جائے گی۔ تو دُنیا کے لئے خدا ایک راز نہ رہے گا۔ دُنیا کو خدا کی تمیز کی منزل پر پہنچنے کے بعد عبادت کی کیا ضرورت رہتی ہے۔

(سائنس (طبعیات اور کیمسٹری)) ———— قوتِ حیات کی نئی حیاتیاتی ہیئت قائم ہونے پر مکانی سائنس پر ذہن کو قابو ہو جائے گا اور یہ زندگی کی بہتری کے لئے کام کرے گی۔ حیاتیاتی سائنس میں حیرت انگیز انکشافات اور طریقے معلوم ہو جائینگے اور نوع انسان کی قوتِ حیات پر قابو ہو جائے گا جس کی وجہ سے وہ سائنس کو غلط سمت میں استعمال نہ کر سکے گی۔

(تمدن) ———— تمام نوع انسان کے رہن سہن کا ایک ہی فطری ارتقائی طریقۂ زندگی ہوگا۔ نسل اور قوم کے تصورات ختم ہو جائینگے۔ یہ جغرافیائی حد بندیوں کے پیدا کردہ تھے۔ مخلوط شادیاں ہوں گی اور ایک ہی زبان تمام دُنیا میں عام ہوگی۔

(حکومت) ———— تمام دُنیا پر ایک صدر کی حکومت ہوگی۔ جو خود شعوری ارتقا کا نمایندہ اور حیاتیاتی نقطۂ نگاہ سے صحیح شعور کا حامل ہوگا۔ اور زندگی کی صحیح رہنمائی کر سکے گا۔ وراثت کا رواج ختم کر دیا جائے گا۔ اجارہ داری اور جلب منفعت کے مواقع مسدود کر دئے جائینگے۔

(سیاسی نظام) ———— عالمگیر تبادلہ کا قیام۔ کسٹم ڈیوٹی کی تنسیخ۔ فوج کا اختتام۔ جیلوں کو توڑ دیا جائے گا۔ ادراک پر کنٹرول ہونے کے بعد ان کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ نہ فوج کی۔ مستقل امن قائم ہو جائیگا۔

(تعلیم) ———— غلط مسائل اور کتابی علم اور ذہنی تکان کے بجائے آزاد ذہن زندگی کی جدوجہد میں صحیح طور پر نشو ونما کر سکے گا اور ترقی و انکشافات کی راہیں وا ہوں گی۔

خدا کی تمیز | ذہن پر موت کا پردہ وا ہونا | مستقل امن کا آغاز | آزاد ذہنی نشوری اور شعوری ترقی | قوت محرکہ اور قوت حیات کا صحیح ظہور | نوع انسان کے ادراک اور قوت ارادی پر کنٹرول
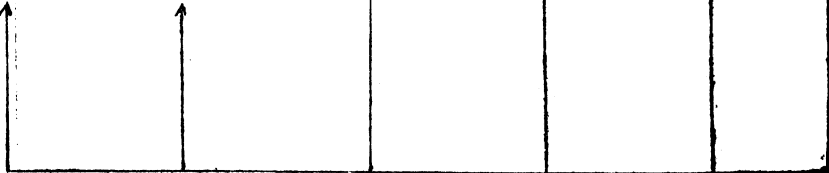
خود شعوری ہیئت ذہنی کے نتائج

ایشیا جلد جلائی ۱۹۴۷ء

اکرام حسین بی-اے

(مسلسل)

جدید بنگالی شاعری

"ٹیگور انسانوں میں ہمہ گیر انسان ہے۔ شاعری میں بے نظیر شاعر۔ اور ہمارا یہ عہد ٹیگور کا عہد ہے"۔ جدید بنگالی شاعری رابندر ناتھ ٹیگور کی ہمہ گیر خلاّقانہ، اور ندرت پسند شعری کاوشوں اور کاہشوں کی منت کش تعبیر ہے۔ ٹیگور کی شاعری سے قطع نظر اُسکی شخصیّت کا شعوری اور غیر شعوری اثر تمام شاعروں پر پڑا۔ یہ اثر گزشتہ یورپی جنگ تک کافی گہرے نقوش اُبھار چکا تھا۔ جس نے تمام عالم کے مروجہ سماجی نظام کو بدل دیا۔

ہماری قومیّت کا تمدّنی سانچہ بنگال میں تیار ہوا۔ جس نے زندگی کے ہر شعبہ میں تغیّراتی نقطۂ نگاہ پیدا کر دیا۔ مغربی علوم و فنون کا چرچہ پہلے پہل بنگال ہی میں شروع ہوا۔ سیاسی و سماجی اصلاح کی صدا بھی وہیں سے بلند ہوئی۔ انہیں تبدیلیوں کی بنا پر سیاسی، معاشرتی، اقتصادی اور ادبی، تمام نظریات نئے معیار اور "جدید" کا نئے پیمانوں سے جانے لگے۔

بنگال ہمیشہ سے مغربی تحریکات کو جذب کرنے اور اپنے تمدّنی معیار اور قومی ضروریات کے مطابق اُن سے استفادہ کرنے کے معاملے میں پیش پیش رہا ہے۔ یورپ میں زندگی کے مختلف شعبوں میں تغیّر و تبدّل رونما ہوا جس نے نونیاز بنگال کی وسعتِ فکر و خیال کو چمکا دیا۔ نئے زمانے اور نئے نظریاتی تغیّرات کے ساتھ ساتھ، آمد و شد کے نئے ذرائع۔ نشریاتِ لاسلکی نئے "گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ" نے کسی قدر طاقت عوام کے ہاتھوں میں پہنچا دی۔ دو مختلف قوموں کے درمیان شادی بیاہ کے معاملے میں جو دیواریں حائل تھیں اُسے ترقی پسند سماجی نظام کے حامل گروہ نے کچل دیا۔ تعلیم کی بڑھتی ہوئی رو اور کتابوں کی طباعت اور اشاعت کی وجہ سے ملک میں تحقیق و تدقیق کا مادّہ پرورش پاتا جا رہا تھا۔ صنعتِ فلم سازی مغربی تحریکات کو ہند کی سرزمین اور پھر ترقی پسند دماغوں تک لانے میں ممد و معاون ثابت ہو رہی تھی۔ اکثر بڑے شہروں میں مخلوط تعلیم کی وجہ سے جنسی نظریات و تخیلات بدل رہے تھے۔ قومی حکومت کا تقاضا، روس، جرمنی اور جاپان میں ہندوستانی پناہ گزینوں کے ذریعہ نئے سیاسی عقائد کی اشاعت۔ خصوصاً اوّل الذکر دو ممالک میں ملوکیت کے بُت پاش پاش ہو جانے پر نئے رجحانات کی نشر و اشاعت نے زاویۂ فکر بدل دیا۔ "اچھوت ادّھار" کے مسئلہ نے بھی ایک حد تک سماجی زندگی کے بکھرے ہوئے مروّجہ نظام میں تبدیلی کی ایک لہر دوڑا دی۔

ٹیگور صرف ایک باکمال شاعر ہی نہ تھا بلکہ ایک ہوشیار نبّاض بھی۔ اُس نے نہ صرف بنگال کی روح کو جلا دی بلکہ وہ اُس کی روح کو پا گیا۔ اُسکی نظریں زندگی کے اس اُلجھاؤ سے نکل کر اُن کے حل تک پہنچنا چاہتی تھیں۔ اُسکے مذہبی مقالات معاشرتی تحریرات میں، ادبی مضامین ڈراموں اور ناولوں میں ہم ایسی سماجی ہیجان کو حیرت انگیز طور پر نغمہ سرا پاتے ہیں لیکن اُسکی شاعری کے قالب سے قطع نظر، اگر ہم ٹیگور کے نفس مضمون پر آتے ہیں تو یہاں بھی وہی جمود اور بے حرکتی دیکھتے ہیں جو گوتم بدھ اور ٹالسٹائی سے منسوب ہے۔ ٹیگور اور اُسکے زمانے کے شاعروں کا امتیازی فرق موضوعات نہیں بلکہ شاعری کا تصوّر و تخیّل ہے۔ ٹیگور کے خیال کے مطابق شاعری ذہنی شعور، علمیّت اور ادراک کی لطیف روح، نزہت زا خوشبو اور رعنائی پرور انگڑائی ہے ـــــ اور یہی ایک ایسا زینہ ہے جسکی مدد سے ہم زندگی کی ابدی سچائی اور حقیقتوں تک پہنچ سکتے ہیں اُسکے نزدیک ایک بے تاب آنسو یا ایک بے اختیار مسکراہٹ کی طرح شعر دل کی کیفیّت کی تصویر ہوتا ہے لیکن ہمارے نوجوان بنگالی شاعروں کیلئے شاعری محض حکایتِ زبان و بیان ہے۔ اُن کے نزدیک ہمارے اخلاقی شعور کو بیدار کرنا ہی شاعری کا مقصد نہیں جیسا کہ (Words worth) کا ایمان تھا۔ یا زندگی کے ابدی مسائل کی تفسیر جیسا کہ (Browning) کا شاعرانہ

نصب العین تھا۔ وہ اپنے موقلم سے نقاشی اور پُرکاری نہیں کرتے جیسا[۱] ٹیگور نے اپنے شاہپاروں میں ہر جگہ کیا ہے۔ وہ ایک سائنسداں کی طرح انسانی زندگی کے اُن جذبات و احساسات کا تجزیہ نہیں کرتے جو ہومر (Homer) کے زمانے سے آجتک جاری و ساری ہے نہ اُنہیں وہ پرشوکت و پرعظمت ہستی ہی نظر آتی ہے جو ٹیگور کی شاعری پر چھائی ہوئی ہے۔

کولرج (Coleridge.) اپنی مشہور تصنیف (Biographia Literaria) میں شعری فطانت کے یہ لوازم قرار دیتا ہے "حسن لطیف شعری فطانت کا جسم ہے۔ تصوّر اُس کا عبہری لبادہ۔ ایک کپکپی، ایک حیات بخش تھرتھراہٹ اُسکی زندگی اور تخئیل اُسکی روح ہے جو ہر جگہ اور ہر ایک میں پائی جاتی ہے" شعری فطانت کے یہ لوازم کتنے ہی ضروری ہوں، نئے شاعروں میں کم و کیف انکا فقدان ہے۔ وہ تجزیۂ نفس تحت الشعور میں حکمت تامہ رکھتے ہیں۔ وہ صوتی نغمات (Evocative rhythm) اور عکسی ترتیب (Image Sequence) پر سر دُھنتے ہیں۔ اُن کے نزدیک نظم کی ظاہری شان و شوکت، ــــ دقیق الفاظ، رنگین تراکیب، بعید از قیاس استعارے، دور از کار تشبیہات ــــ اُسے زندہ رکھتی ہیں ــــ (Word worth) کا خیال ہے کہ تمام اچھی نظمیں "شدت جذبات کے ... مثالی تحریک (Symbolist movement) کے مخالف کے خیال کے مطابق بھی "شعر کی تخلیق خیال سے نہیں، الفاظ سے ہوتی ہے" ان نئے رومانی شاعروں نے مغربی شعری شعور کو اپنایا اور تصوّراتی (Imagists) اور (Surrealist) شاعر ــــ (David Gascoyne) کا اتباع کیا۔ وہ انگریزی، امریکی اور غیر ملکی شعراء کی خوشا چینی کرتے ہیں۔ جن میں سے چند نام حسب ذیل ہیں: ــ Masefield Blunden Spender, Davies, Edith Sitwell, Walter De La Mare, Eliot, Pound, Poe Mallarme, Rimbaud.....

. . . .

اور بعض اوقات روسی کمیونسٹ شعراء کے اتباع سے بھی دامن نہیں بچاتے۔ لیکن ان شعراء کی مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ مغربی شعراء کے اتباع کے باوجود اُن کی ملکی روایات میں کوئی فرق نہیں آتا ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں یہ تو مشکل ہے کہ تمام شعراء کے ذاتی رجحانات اور تحریکات شعری کا تجزیہ کیا جائے۔ لیکن جدید شاعری کی رفتار اور اس کی تدریجی ترقی کے اظہار کیلئے یہ ضروری ہے کہ چند مخصوص صاحب اسلوب اور مختلف الخیال اسکول کے شعراء کے کلام پر روشنی ڈالی جائے۔

ٹیگور کی شاعری کی مابہ الامتیاز خصوصیّت اس کا بیساختہ پن ہے اصل بنگالی میں ان گیتوں میں سے ہر ایک اپنی سادگی، تازگی، برجستہ پن، معانی کی نزاکت اور بلندی، بیان کی روانی، الفاظ کے حُسن انتخاب، موزونیت، ترنم اور سُر تال کی ندرت اور دلکشی میں شاعری اور موسیقی کا لاجواب نمونہ ہے۔

ٹیگور انسانی آزادی کا علمبردار ہے۔ غلامی اور جہل و حقارت کی گود میں پلی ہوئی موجودہ تہذیب و تمدّن کی دُنیا میں وہ آزادیٔ فکر و عمل اور باہمی صلح و محبّت کا پیامبر ہے۔ ٹیگور کی زندگی فرسودہ، بے معنی رسم و رواج اور مُردہ و بوسیدہ مذہبی توہمات کے کٹھن بندھنوں کو کاٹتی ہے ؎

"مجھے معلوم نہیں عبادت کسے کہتے ہیں!
جبھی تیرے دروازے کی خاک پر بیٹھا صرف رویا کیا ہوں!
میں بے سمجھ تھا، اور جس طرح میرے دل میں آیا میں چلا آیا!
میں اندھیرے میں تجھ سے ڈرا نہیں!
لیکن یہ عارف تیرے،
مجھے سخت طعنہ دیتے ہیں۔
کہتے ہیں "تو یہاں آنے کی مناسب راہ سے نہیں آیا، لوٹ جا!"
میرے لوٹنے کا راستہ تو تم نے بند کر رکھا ہے!
اور وہ بیکار پکار رہے ہیں "لوٹ جا، لوٹ جا!""

(ایگیت ـ بنجاشیکا)

اور: ــ

"لوبان چاہتا ہے کہ اپنے آپ کو خوشبو بنا کر اُڑا دے!
خوشبو چاہتی ہے کہ لوبان کو اپنے سینہ میں چھپائے رکھے!
نغمہ چاہتا ہے کہ سُر تال کا پابند رہے،
سُر چاہتا ہے کہ نغمہ کو لے کر اُڑ جائے!
خیال چاہتا ہے کہ مجسم صورت میں جلوہ گر ہو،

[۱] ... بستہ ہوکر لکھتے ہیں۔ اُنکے نزدیک "کوئی ترسیت اکم واکم" (شاعری الفاظ کے ترنم کا نام ہے) یہی سب کچھ ہے۔ (MALLARme) ملارمے فرانسیسی شاعری کا ...

اور صورت کی آرزو ہے کہ عالمِ خیال میں آزاد رہے !
گرہ کا کھلنے کی فکر میں رہنا،
آزادی کا زنجیروں کی ارزو کرنا،
یہ عالمِ ہست و نیست میں کسکی خوشی ہے جو کارفرما ہے !"
(۲-گیت - اتشنگ)

"میرا اندھیرا ہی بھلا ہے !
اپنے آپ کو روشنی کے حوالہ تو کر سکے گا !
روشنی کا حریص دیکھو، نور کو کس طمع سے سمیٹتا ہے -
بس یہی طمع کا دھندلکا تباہ کن ہے !
بچّہ ماں کی گود میں اطمینان سے دودھ پیتا ہے،
لیکن مغرور عقلمند تیری بارگاہ کے دروازے پر روک دیا جاتا ہے !
تیری راہ اپنا دروازہ خود دکھاتی ہے !
پروردگار ! میں تیری اس راہ پر سیدھا چلوں گا !
اور وہ جو راستہ ہٹانے کے لئے آ جمع ہوئے ہیں -
وہ تیری راہ میں سنگِ راہ ہیں !"
(۳-گیت - پروباہی نی)

ٹیگور نے مروّجہ تعلیم کے خلاف جہاد کیا - اور "وشوا بھارتی" کا سنگِ بنیاد رکھ کے یہ ثابت کر دیا کہ مصنوعی قید و بند سے آزاد ہو کر نام نہاد حدود کو توڑ کر بھی حقیقی اور سچّی تعلیم کی روشنی حاصل کی جا سکتی ہے - ٹیگور نے انسان میں انسانیت کے خدا کو دیکھا ہے اور اسی لئے اُسکی توہین وہ کسی رنگ میں برداشت نہیں کر سکتا -

ٹیگور کی عظمت کا سنگِ بنیاد، اُسکی لاثانی شخصیت کا مدار وہ نغمہ ہے جو اُس نے اس حسین دُنیا کے تن میں حُسن و سرور کی روح پھونکنے والے "شاعرِ کائنات" محض حُسن، محض سرور کی مدح و ثنا میں گایا ہے :-

"خوف نہ کھاؤ کہ پیغام پریشان کرتے ہوئے،
پھٹے بادبانوں میں سینے کو تان کر،
میں اپنی کشتی کو کھینا اُس پار لیجاتا ہوں !
میرا رہنما وہی ہے -
جو مجھے ہر حال میں دیکھ رہا ہے !
میرے دل میں کھٹکا نہیں -
میں کشتی کو منجدھار میں چھوڑتا ہوں،
مجھے اُس پر بھروسہ ہے !
دن ڈھلے پر مجھے یقین ہے کہ کشتی تیرے سہارے پار لگے گی !
وہاں میں اپنے دردِ دل کے سُرخ پھول کو -
تیری رحمت کے قدموں میں رکھ دونگا !"
(۴-گیت - مکت دھارا)

"آہ میری راتیں اس طرح کیوں برباد ہو رہی ہیں ؟
آہ، کیوں ہمیشہ میں اسکے مشاہدے سے محروم رہتا ہوں -
جس کے تنفس کا اثر میں اپنے خوابوں پر محسوس کر رہا ہوں"
(نغمہ ۲۶ - گیتانجلی)

"میں تجھے اپنے خدا کی حیثیت سے جانتا ہوں اور تجھ سے علیحدہ ہوں میں تجھے اس ہستی کی حیثیت سے نہیں جانتا جو میری ہو، اور تجھ سے قریب تر نہیں ہوتی - میں تجھے اپنے باپ کی حیثیت سے جانتا ہوں اور تیرے قدموں میں سر بسجدہ ہوں - میں تیرا ہاتھ اپنے دوست کا ہاتھ سمجھ کر نہیں پکڑتا"

(نغمہ ۷۷ - گیتانجلی)

ٹیگور نے وہ گیت سُنے ہیں جو مُغنّیٔ فطرت اپنے قدرتی مظاہر میں ہمیشہ گائے جا رہا ہے اُس کا دل و دماغ انہی قدرتی گیتوں کے لا جواب سروں سے گونج رہا ہے اور وہ خود مجسّم سرور و نغمہ ہو کر گاتا ہے - ٹیگور کا معبود اور معشوق وہ شاعر اور مصوّر ہے جو اُس کی زندگی میں لطف اور سرور، غم اور اندوہ کی سریں پھونک رہا ہے، اُس کی زندگی میں عجیب و غریب کیفیات کے رنگ بھر رہا ہے - شاعر اُسکے عشق میں ہے اور اُسکے حُسن کو قدرت میں دیکھ کر اُس کی تعریف میں نغمہ سرا ہے -

ایشیا کا عرفان، اُپنشدوں کا گیان، جو رشیوں کی خصوصیت تھا وہ ہمارے دور کی آزادی اور جدید علمی تحقیقات اور فلسفیانہ حقائق کی روشنی سے مل کر ایک حیرت انگیز لافانی موزونیت کی صورت میں ہم ٹیگور میں موجود پاتے ہیں - ٹیگور اپنی شاعری کے عالم کا آپ ہی خالق ہے - اُس سے قبل کی بنگالی شاعری کی وہی حالت تھی جو اُردو کی میر اور مرزا غالب سے

سے پہلے اُس نے اپنے مذاق کے مطابق عروض کے قواعد الفاظ کے استعمال اور اظہارِ خیال کے میدان میں بھی اصلاحیں کیں۔ وہ خود کہتا ہے :۔

"دل کی خوشی کے چڑھتے ہوئے سیلاب کے ریلے کے سامنے
بندھی بندھائی عروض کی بحریں اور وزن اپنی جڑیں زمین
میں سنبھال کر نہ رکھ سکے۔ اور جس طرح ندی سیدھی راہ نہیں بہتی
اپنی ترنگ میں گھومتی، چکر کاٹتی چلی جاتی ہے، میرے اشعار
کے بہاؤ میں بھی خودسری تھی ۔"

قاضی نذر الاسلام ۔ اسکے بعد نذر الاسلام کی ہستی ہے، ٹیگور نے خود بار ہا نذر الاسلام کی شاعرانہ عظمتوں کو تسلیم کیا ہے۔ اس لئے ہم ٹیگور کے بعد بنگالی کا سب سے بڑا شاعر نذر الاسلام ہی کو مانتے ہیں۔ نذر الاسلام کی شہرت کی بنیاد اُسکی "باغیانہ نظموں پر قائم ہے۔ کون اُسکی نظم "باغی" اور "طوائف" سے انکار کرسکتا ہے۔ اُسکی نظموں میں مضمون کی مناسبت سے کچھ اس قسم کے الفاظ ہوتے ہیں کہ اُن میں ایک انقلاب انگیز گرج اور ولولہ انگیز شور پیدا ہو جاتا ہے۔

نذرل موجودہ ملکی نظام، سرمایہ داری، بیواؤں کی زبوں حالی، مزدور کی کس مپرسی، اور سماجی بدحالی کے خلاف ہے۔ وہ کھلے ہوئے پیرایہ میں (socialism) اشتراکیت کا پرچار کرتا ہے۔ اُسکے نزدیک ملکی بدحالی کو دور کرنے کا ایک ہی واحد علاج ہے۔ چونکہ وہ خود سپاہی رہ چکا ہے اس لئے اُسکی نظموں کا جوش، اُسکے ذہنی نشو و نما کی وجہ سے اور زیادہ بڑھ گیا ہے۔

وہ ایک باغی شاعر ہے اُس کی زیادہ تر نظمیں حکومت اور اُسکی چیرہ دستیوں کے خلاف صدائے احتجاج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُسکے بیشتر مجموعے ضبط ہو جاتے ہیں۔

اُس کی قومی اور انقلابی نظموں کا نئے شاعروں پر گہرا اثر پڑا۔ اور یہ بھی دیکھتے ہوئے، اب وہ خموش ہو گیا ہے۔ (ٹیگور کے شرادھ کے موقع پر میں نے اُس سے مل کر یہی رائے قائم کی ہے) اب اس نے اپنا اصلی رنگ چھوڑ کر محبت اور نیچر کو اپنا موضوع شاعری بنا لیا ہے۔ نذرل اس معاملہ میں جوش کے بالکل برعکس ہے۔ نذرل نے پہلے بغاوت کی آگ اُبھالی اور پھر "محبت" اور "نیچر" کے گیسو سنوارے۔ مگر جوش پہلے ایک نشاطی و رومانی شاعر رہا بعد کو انقلاب اور اشتراکیت کے گیت گانے لگا۔

اب نذر الاسلام رومانی شاعر ہے اور اُس کی اکثر رومانی نظمیں شعری لطافت کے لحاظ سے انتہائی مقبول ہوئی ہیں۔ بہت دنوں سے وہ چھوٹے چھوٹے گیت لکھ رہا ہے جو فارسی کی غزلوں کی طرح نرم و شیریں ہوتے ہیں۔

نذر الاسلام ایک غریب گھر کا چشم و چراغ تھا۔ بردوان کے ایک گاؤں میں وہ آج سے ۴۵ سال قبل پیدا ہوا۔ قدرت کی آغوش میں پروان چڑھا۔ اسکول اور کالج کی تعلیم سے بے نیاز رہا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں فوج میں بھرتی ہو کر عراق چلا گیا۔ جنگ کا میدان اسکے لئے سب سے بڑی درسگاہ ثابت ہوا۔ جب لڑائی کے میدان سے ہندوستان لوٹا تو چند نظموں کے مسودے اسکے ساتھ تھے۔ اُن کا مجموعہ "اگنی وینا" (آگ کی بانسری) کے نام سے شائع ہوا۔ یہ آٹھ یا نو نظموں پر مشتمل ہے جس میں سے دو کو چھوڑ کر باقی سب عراق میں لکھی گئیں۔ ان سب میں اسلامی روایاتی زندگی کی دھڑکن پائی جاتی ہے۔ اور اُن میں ہم ایک مسلمان انقلابی، ایک اسلامی مجاہد کی جھلک دیکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو اس زمانے میں اُسے آزادی کی لگن اور ظلم سے نفرت تھی۔

کسان تو وہ ابتداہی سے تھا۔ لیکن عراق کی جنگ نے اُسے سپاہی بھی بنا دیا "کسان سپاہی ہیں انقلاب گری کے بڑے بڑے امکانات پنہاں ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ اس کا ساتھ مزدور سے ہو جائے۔ کسان، مزدور اور سپاہی ـــ ان تینوں کا اتحاد دُنیا کی تمام جابر سلطنتوں کا تختہ اُلٹ سکتا ہے۔ زار کا زوال اس حقیقت کا ثبوت ہے ۔"

"مسلمان کی گرم گفتاری، کسان کی حقیقت پسندی اور سپاہی کا جوش یہ تینوں چیزیں نذر الاسلام کو ودیعت کی گئی تھیں۔ مزدور کی انقلابی سرشت کی کمی تھی، سو وہ بھی بعد میں پوری ہو گئی ۔"

عراق سے واپسی پر اُسے اپنے خیالات کی تہذیب اور تعلیم کا موقع ملا اسی زمانہ میں اُس نے وہ نظم "ودروحی" (باغی) لکھی جس نے اُسے ادبی انقلاب کا پیشوا بنا دیا۔ پروفیسر سرکار اپنی کتاب "ایشیا کا مستقبل" (Futures of Asia) میں اس طرح لکھتے ہیں :۔

" جب میں نے نذر الاسلام کی نظم "باغی" کو پڑھا تو مجھے محسوس

ہوا کہ گزشتہ دس سال سے ہم بنگلہ ادب میں جس انقلاب کے متوقع تھے آج اُس کا آغاز ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ادب میں زندگی اور جوش کا ایک دریا لہریں مارنے لگا۔ مسلمانوں نے اب تک اپنی مادری زبان کی خدمت اتنی نہیں کی تھی جتنی ان پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن اب ثابت ہوا کہ بنگال کی سوئی ہوئی روح کو بیدار کرنے کا سہرا شاید ان ہی کے سر بندھنے والا تھا۔"

"باغی" بنگلہ ادب میں اپنی نوعیت کی اچھوتی چیز ہے۔ وکٹر ہیوگو (طوفان) سوئن برن (ہرسیتھا) اور لارڈ بائرن (تخریب) جیسے باکمال شعراء نے اس موضوع پر نظمیں لکھی ہیں اور پشکن کا ترانہ "آزادی" روسی انقلابیوں کے دلوں میں اُتر چکا ہے۔ لیکن "باغی" کی عظمت اور بلندی ان سب سے بڑھ کر ہے۔ یہ "باغی" یونان کا رستم ہرکلس نہیں جس کی ٹانگیں آہنی ستونوں سے زیادہ موٹی تھیں۔ بلکہ ہومر کا تشکیل و جمیل ہیرو ایکیلس ہے جس کی تلوار میں اتنی ہی کاٹ تھی جتنی کہ اس کے نکھری آنکھوں میں۔"

اگرچہ بغاوت کا ایسا خاکہ مشکل سے کہیں ملے گا۔ لیکن پھر بھی اُسکے خیالات میں اس وقت تک پختگی اور صفائی نہیں آئی تھی اور نہ اُس کا نظریۂ زندگی ہی واضح ہوا تھا جس کی مثال "نعرۂ انقلاب" میں ملتی ہے۔

"آگمنی" (آمد) اور "وِدروھی" (باغی) نظموں نے بنگال کے ادبی حلقوں میں ایک ہیجان پیدا کر دیا۔ قدامت پسندوں نے ان پر سخت شور مچایا۔ ان کی نرالی سج دھج ایک نئے دور کا اعلان کر رہی تھی۔ ٹیگور اسکول کے مقلدین کو یاد نہیں رہا کہ انہوں نے بھی بنکم چندر اور ڈی۔ ایل۔ رائے کی روایات کو توڑ کر اپنے لئے ایک نیا راستہ بنایا تھا۔ اس ادبی جہاد سے جوان اور بوڑھے دو گروہ میں بٹ گئے اور اُن کے تنازعہ کی بنا نذرالاسلام کی شاعری قرار پائی۔

نذرالاسلام کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت وہ پیغام ہے جو وہ اپنے وطن کے نام لایا تھا۔ یہ اُن سرفروشوں کا پیغام تھا جو انسانیت کی نجات کی خاطر دیس پردیس میں سولیوں پر چڑھ رہے تھے۔ مگر اس پیغام سے قطع نظر اُس نے جس اسلوب میں اس پیام کو دُنیا کے سامنے پیش کیا وہ بھی کچھ کم اہم نہ تھا۔ "شاعری یا ادب کے ہر شعبے میں طرز یا اسلوب کو سب سے بڑا مرتبہ حاصل ہے۔ اور اچھے سے اچھا مضمون اسلوب کے نقص کی وجہ سے بے اثر اور بے جان رہ جاتا ہے۔" نذرالاسلام اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھا اور اسی لئے اُس نے اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کیلئے ایک ایسے اسلوب کی بنا ڈالی جو اُس کے پیغام کا حامل ہو سکے۔

ٹیگور کے بنائے ہوئے سانچے غنائی نظموں کیلئے انتہائی موزوں تھے۔ لیکن رزمیہ شاعری کی آنچ پڑتے ہی وہ تڑخ جاتے تھے۔ چنانچہ نذرالاسلام نے فارسی اُردو کے سبک الفاظ کے رچاؤ سے اپنی نظموں میں خاطر خواہ زور و اثر پیدا کیا۔ نذرالاسلام کی اس جدت نے بنگال کے ادبی پاکبازوں (Pharisees) میں ایک آگ سی لگا دی۔ ہر طرف سے اس پر اعتراضات کی بوچھار شروع ہو گئی۔ اور اکثر (Literary Philistines) نے اسے فرقہ پرست اور رجعت پسند قرار دے دیا۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ اس نئے رجحان کی خوبیوں کو سمجھ گئے اور نیا اسلوب بنگلہ میں کافی مقبول ہو گیا۔ اب تو اسکے تتبع میں غزل نگاری بنگلہ شاعری کی خاص صنف ہو گئی ہے اور اس صنف کا محرک بھی نذرالاسلام ہی ہے۔

نذرالاسلام کو چونکہ بچپن ہی سے گانے بجانے کا شوق تھا۔ لڑکپن میں اس نے اس فن کو حاصل بھی کیا تھا۔ موجودہ عہد میں وہ موسیقی کا اُستاد اور مجتہد مانا جاتا ہے۔ اس لئے اُس کی نظموں میں ایک رزمیہ موسیقی پیدا ہو گئی ہے جو اُس کی دوسری خوبی ہے اور جو اُس کے پیام کو پُر اثر بنانے کیلئے ناگزیر تھی۔

"پیغام کی نوعیت، زبان و بیان کی جدت اور طرزِ کلام کی قوت۔ یہ وہ خوبیاں تھیں جنہوں نے بہت کم عمری میں نذرالاسلام کو بنگال کا سب سے عظیم مقبول شاعر بنا دیا۔"

نذرالاسلام نے حولداری کی وردی چھن جانے پر، حکومت کے عتاب اور قدامت پرستوں کی مخالفت کی ذرا بھی پروا نہ کی۔ اُسکے عزائم اور نصب العین میں بھی کچھ فرق نہ آیا۔ سنہ ۱۹۲۰ء اور سنہ ۱۹۲۴ء کے عرصہ میں اس نے دو ہفتہ وار "کلّول" اور "نوروز" جاری کئے لیکن سیاسی ہنگاموں کے ختم ہونے پر ہندو مسلم فساد کی وجہ سے انہیں بند کرنا پڑا۔ لیکن "کلّول" کا اثر غیر شعوری طور پر بنگالی دماغ پر چھایا رہا۔ اور "کلّول اسکول" کے ادیب یورپ کے رومانی ادیبوں کی طرح اپنے لئے ایک خاص مقام بنا گئے۔ انہوں نے مولویوں اور پنڈتوں کی زندگی کو بے نقاب کر کے اُن کے حجروں کو ماتم کدہ بنا دیا۔ ان ادیبوں میں سے کچھ نے نذرالاسلام کے ساتھ ہو کر سماجی انقلاب

کو اپنا اصلی مقصد بنا لیا۔ اور کچھ "جیمس جوئس" اور "فرائیڈ" سے متاثر ہو کر جنسی اصلاح میں کھو گئے۔

۱۹۲۶ء نذرالاسلام کے لئے بڑا منحوس ثابت ہوا۔ اُس کے مربی سی۔آر۔داس کا انتقال ہو چکا تھا۔ کوئی اُس کی پُشت پناہی پر نہیں رہا تھا۔ مخالفت کا ایک شور بلند ہوا۔ اپنے اس شور میں اُسکی آواز کو جذب کر لینے کے لئے۔ ہندو مسلم فساد کی وجہ سے ملک کی جو حالت تھی اُس کی وجہ سے وہ فرقہ پرست کے نام سے سرفراز کیا گیا۔ اسی دوران میں اُس نے ایک ہندو لڑکی سے شادی کر لی۔ پھر کیا تھا۔ فرقہ پرست اسکی جان کے دشمن ہو گئے اور ہر طرف سے اعتراضات کی آگ اُچھالی جانے لگی۔ حکومت کی چیرہ دستیوں، مولویوں کا غصّہ اور اب ہندو جماعت کے ستم کو وہ اپنی ایک نظم میں اس طرح بیان کرتا ہے: —

"میں زمانۂ حال کا شاعر ہوں، مستقبل کا پیغمبر نہیں ہوں۔
کوئی کہتا ہے اگلے زمانے میں تجھے کون یاد کرے گا۔
کوئی کہتا ہے شاعر کو قید و بند سے کیا واسطہ۔
کوئی کہتا ہے دوبارہ جیل جا کر وہیں خوب لکھ سکتا ہے۔
مولوی میرے چہرے پر اسلام کی علامت (ڈاڑھی) نہ پاکر
مایوسی سے اپنی ڈاڑھی کھجانے لگتا ہے۔
ہندو کہتے ہیں کہ اس نے ہندو لڑکی سے شادی کر لی ہے،
لہٰذا یقیناً فرقہ پرست ہے۔
گاندھی جی مجھ پر تشدد پسندی کا الزام لگاتے ہیں۔
عورتیں کہتی ہیں کہ یہ دشمنِ نسواں ہے اور مرد مجھے عورت پرست
بتاتے ہیں —
غرض کہ میری جان ضیق میں ہے۔
لوگو! مجھے اسکی پروا نہیں کہ مستقبل مجھے یاد کرے گا یا نہیں۔
تمنا صرف یہ ہے کہ جو لوگ خلقِ خدا کو بھوکوں تڑپا رہے ہیں،
میری خونچکاں تحریر ان کے لئے پیامِ موت ثابت ہو"

افلاس اور غربت، گرسنگی اور بیچارگی نے اس کی بغاوت گری کا گلا مسوس دیا اور مجبور ہو کر اُسے وہ گیت لکھنے پڑے جو آج بنگال کے بچے بچے کی زبان پر ہیں۔ جن میں ادب سے زیادہ موسیقی کو دخل ہے اور یہی رنگ اب اُسکی شاعری پر غالب آ چکا ہے۔ اُس کی انقلابی شاعری ۱۹۲۰ء سے شروع ہو کر ۱۹۳۵ء تک سرد ہو گئی۔

نذرالاسلام کی شاعری کو تین مختلف ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ابتدائی دور تحریک خلافت کے ساتھ شروع ہوا۔ اس زمانے میں "انور پاشا" اور "مصطفےٰ کمال" پر دو چھوٹے چھوٹے رزمیہ منظوم مکالمے لکھے۔ معرکۂ کربلا پر بھی چند نظمیں ہیں۔

دوسرا دور "باغی" کی اشاعت سے شروع ہوتا ہے یہ وہ زمانہ تھا جب بنگال میں بم بنائے اور پھینکے جا رہے تھے۔ نوجوانوں کے دلوں میں جوش اور امنگ کا دریا لہریں مار رہا تھا اور Terrorist پارٹی زور پکڑ رہی تھی۔

تیسرا دور ۱۹۲۶ء سے شروع ہوا۔ یہ نذرالاسلام کا اشتراکی دور کہلاتا ہے۔ اب وہ زندگی کے فلسفہ کو پا گیا۔ مزدور کی گرد سے اٹی ہوئی پیشانی، طوائف کے آنسوؤں کی رنگین عورت کا درجہ، فلسفۂ "حاکم و محکوم"۔ "دو نگاہ" کی چاشنی، سچائی کے زہر کے ساتھ ساتھ، بنگال کی سرزمین کا قدرتی رومان اُس پر اثر کر ہی گیا۔ "وہاں کے اودے اودے بادلوں، گھنے پیڑوں اور ڈبڈبائی ہوئی ندیوں کے پیچھے رومان مسکراتا ہے"۔ نذرالاسلام پر بھی یہ جادو چل گیا۔ اس کا ہلکا سا پرتو "یادِ ایام"، "دریا کا گیت"، "مجھے یاد کرو گی"۔ نظموں میں نظر آتا ہے۔

نذرالاسلام پہلا بنگالی شاعر ہے جس نے اپنے زمانے اور اسکی مروجہ روایات کے خلاف اعلانِ جنگ کیا۔ وہ ایک آفتابِ تازہ کی تلاش میں تھا جو موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کو کچل کر قوم و مذہب، رنگ و نسل کی حدوں کو توڑ کر دُنیا کو مساوات اور آزادی کا درس دیتا ہے اور اس نئے دور کا وہ یوں اعلان کرتا ہے: —

"وہ مبارک ساعت آپہنچی —
ہتوڑی اور کدال سے جو پہاڑوں کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے،
راستے کے دونوں طرف جس کی ہڈیاں بکھری پڑی ہیں،
تمہاری خدمت کیلئے جس نے قلی اور مزدور کا روپ لیا ہے،
تمہارا بارِ گناہ اُٹھانے کے لئے جو ہمیشہ خاک آلودہ رہتا ہے،
وہی — صرف وہی مزدور مکمل انسان ہے۔ میں اُسی کے

گیت گاتا ہوں۔ اس کا ٹوٹا ہوا دل ایک نئی دُنیا کی
تعمیر کرے گا۔
آج مظلوموں اور بیکسوں کے خون سے رنگ کر بطن گیتی
سے آفتاب تازہ پیدا ہوا ہے۔
آج دُنیا کے بندھن کٹ رہے ہیں اور ایک عظیم الشان
دورِ بیداری کا آغاز ہو رہا ہے۔ جسے دیکھ کر خدا مسکراتا ہے
اور شیطان خوف سے لرزتا ہے۔"

نذر الاسلام کے نظریّہ کے مطابق "زندگی دائم و قائم ہے اور انسان لاشریک لۂ اس کا کارساز ہے۔ وہ شباب کا ہمدوش اور انقلاب کا نقیب ہے۔ وہ تغیّر کا حامی اور جمود کا دشمن ہے۔ وہ قدامت کا حریف اور جدید کا علمبردار ہے۔ وہ قدرت اور سماج کے مظالم کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرتا ہے اور شاعری کو اس مہم میں جنگ کی دیوی بنا دیتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان سب سے افضل اور اکمل ہے۔

"میں اپنی خودی کے علاوہ کسی کے آگے سر نہیں جُھکاتا۔
میں اس بوسیدہ سماج کا دشمن اور اسکے لئے خطرۂ عظیم ہوں۔
میں خدا ہوں! میں حقیقی معنوں میں مکمّل ترین انسان ہوں۔"

نذر الاسلام کی شاعری امید اور اُمنگ کا پیغام ہے۔ چونکہ ابھی تک بنگلہ شاعر زندگی کی بے ثباتی اور انسان کی بے چارگی کا رونا روتے آئے تھے۔ اس لئے اُس کی شاعری نے بنگال کو ایک نیا زاویۂ فکر اور ایک جدید خیال دیا جس نے ناامیدی کو امید، یاس کو اُمنگ اور قنوطیت کو تفاؤل میں بدل دیا جس نے شاعری کی مُردہ رگوں میں زندگی کا خونِ گرم دوڑا دیا۔ اُس سے پہلے کے شاعروں کا خیال تھا کہ حقیقت صرف موت کے بعد مل سکتی ہے۔ لیکن کبیر داس کے بعد نذر الاسلام ہی نے اس بات کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا کہ جو شے زندگی میں نہیں مل سکی وہ موت کے بعد کیونکر مل سکتی ہے۔ اُس نے "الٰہی شاعری" [illegible] کے تار و پود کو جلا کر اُس کی گرمی اور حدّت سے انقلابی شراب تیار کی جس سے آج میخانے جھوم رہے ہیں۔

نذر الاسلام نے کبھی دوئی کا پردہ اُٹھانے کی کوشش نہ کی وہ اسے سعیٔ لاحاصل، بیکار مشغلہ، اور فضول سی تگ و دو خیال کرتا ہے اسکے مقابلے میں زندگی کے حقائق کو سُلجھانا اور سمجھنا اس کا محبوب ترین شغل ہے۔ اسی لئے اُس نے صرف دُنیوی زندگی اور اُسکے مسائل سمجھنے سمجھانے میں اپنی تمام تر کوشش صرف کی۔

زندگی اور اُس کے نشیب و فراز کا مطالعہ کرنے کے بعد اُس نے یہی دیکھا کہ ایک طرف انسانوں کی اکثریت جہالت اور افلاس میں گھٹ رہی ہے اور دوسری طرف اُس کی محنت کا پھل چند آرام طلب ہضم کر رہے ہیں ایک طرف جنّت بوس محل کھڑے کئے جا رہے ہیں دوسری طرف ہزاروں جھونپڑیوں کے اندر اپنی بھوک کی آنتیں مسوسے پڑے ہیں۔ نذر الاسلام سے یہ زبوں حالی اور ناانصافی نہ دیکھی گئی۔ اور "باغی" انہیں خیالات کی ترجمانی کرتا ہے۔

اکرام قمر۔ بی۔ اے

روما کے سیاسی افکار

(۱) یونان کی بجائے روما

افلاطون اور ارسطو سے زیادہ متضاد و متباین دو بلند پایہ مفکر تلاش کرنا محال ہے۔ ایک فلسفی اور استنباطی (کسی کلیہ سے جزئی نتیجہ اخذ کرنے والا) تھا، دوسرا سائنسی اور استقرائی (جزئی مثالوں سے کلی نتیجہ اخذ کرنے والا)۔ ایک ترکیبی (متفرق خیالات کے ربط اور ترتیب سے کوئی نظریہ قائم کرنے والا یا متعدد نظریوں کو ربط دیکر نظامِ فلسفہ بنانے والا) تھا، دوسرا تحلیلی (کسی چیز کا تجزیہ کر کے اُسکے عام اصول معلوم کرنے والا) ایک داخلی (اشیا اور خیالات کو اپنی اصلی صورت میں نہیں بلکہ صنّاع کے نقطۂ نظر اور ذاتی رجحانات کے مطابق پیش کرنیوالا) تھا، دوسرا خارجی (اشیا اور خیالات کو اصلی و حقیقی رنگ میں دیکھنے اور بیان کرنیوالا)۔ ایک خیال پرست تھا، دوسرا حقیقت پسند۔ ایک کے نزدیک عقل زندگی کی بلندترین رہبر ہے، دوسرا جبلّت کا قائل ہے۔ ایک کا خیال ہے کہ فلسفیوں کے ہاتھوں سے سماج اور ریاست میں اعتدال و ترمیم کی جاسکتی ہے۔ دوسرا رواج، عادات اور روایات کو مستقل اور ناقابلِ تغیّر سمجھتا ہے۔ مگر دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ یونانی شہری ریاست ایک معیاری طرزِ حکومت ہے۔ دونوں کو اس کا اعتراف ہے کہ ان کے وقت کی یونانی شہری ریاست ایک معیاری طرزِ حکومت ہے۔ دونوں کو اس کا اعتراف ہے کہ ان کے وقت کی یونانی شہری ریاست کے بہت سے بیرونی اور اندرونی طاقتور دشمن ہیں۔ دونوں کا یہ اعتقاد ہے کہ تعلیم سے —— ایسی تعلیم شہریت سے جو علم اور راستبازی میں اضافہ کرے —— شہری ریاست کی اصلاح اور تحفظ ہوسکتا ہے۔

لیکن ان کا یونانی شہری ریاست کا نظریہ غلط تھا۔ اس کا زمانہ ختم ہو چکا تھا اور اس کی جگہ بین الاقوامی شہنشاہیت نے لے لی تھی۔ ارسطو نے خود ان لوگوں کی تربیت میں مدد کی تھی جن کے ہاتھوں بعد میں یونانی آزادی کا خاتمہ ہوا۔ اور مغرب میں پہلی عالمگیر حکومت کا قیام عمل میں آیا

یونانی شہری ریاست کے زوال کی فوری وجوہات مندرجہ ذیل تھیں:۔

(۱) اندرونی سخت بدعملی۔ اسکی ارسطو فینز نے اپنی طربیات میں انتہائی مذمّت کی ہے۔

(۲) بڑی ریاستوں نے چھوٹی ریاستوں پر وحشیانہ مظالم کئے اس سلسلہ میں وہ جبر و استبداد خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جو ایتھنز والوں نے ایگیئن شہروں پر کیا اور سپارٹا نے پیلو پونیشین شہروں کے ساتھ اور تھیبز کی حکومت نے بوشین شہروں کے ساتھ روا رکھا۔

(۳) بڑی بڑی ریاستوں کا باہمی جنگ و جدل۔ خصوصاً ایتھنز اور سپارٹا (سنہ ۴۳۱-۴۰۴ ق م) کی پیلو پونیشین جنگ۔ اور

(۴) مقدونوی حملہ اور فتح جو ۳۳۸ ق۔م کی جنگ کیرونیا میں پایۂ تکمیل کو پہنچ گئے۔

مگر زوال کی ان فوری وجوہات کے علاوہ یونانی شہری ریاست کی ساخت ہی میں بہت سے عیوب موجود تھے جنہوں نے یہ بات ناممکن و ناپسندیدہ بنا دی تھی کہ اس ریاست کو انسانی تنظیم کی آخری صورت سمجھتے ہوئے زندہ رہنے دیا جائے۔ یونانی شہری ریاست بہت ہی چھوٹی بہت ہی الگ تھلگ، بہت ہی خود غرض، بہت ہی جھگڑالو، بہت ہی مستبد، فرقہ بندیوں میں بہت ہی بُری طرح جکڑی ہوئی، بہت ہی غیر مستحکم، اور غلامی کے ادارے کے ساتھ بہت ہی بُری طرح جکڑی ہوئی تھی۔ اس لئے بقائے دوام کے خداوندی انعام کی یہ مستحق نہ تھی۔

یہ جگہ اُس مشہور کہانی کے بیان کے لئے موزوں نہیں جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ فلپ شاہِ مقدونیہ نے کس طرح یونانیوں کو تاخت و تاراج کیا اور اسکے بیٹے اسکندر اعظم نے (سنہ ۳۳۶-۳۲۳ ق م) کس طرح مقدونوی شہنشاہی قائم کی۔ صرف یہی بتلا دینا کافی ہے کہ تیرہ سال کی مسلسل و محیّر العقول جنگوں کے بعد اسکندر اعظم ایک ایسی حکومت کے قیام میں کامیاب ہو گیا جو ایڈریاٹک سے لیکر جزائر شرق الہند تک پھیلا

کے مشرق و مغرب کو محیط تھی۔ جہاں تک یونانیوں کا تعلق ہے اس حکومت کے قیام کی دو وجوہات تھیں۔ اول یہ کہ یونانی شہری ریاستوں کی آزادی سلب ہو چکی تھی اور وہ ایک وسیع فوجی شہنشاہی کی بلدیات بن گئی تھیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ یونانی تہذیب دُنیا کے اُن دور دراز خطوں تک پہنچ چکی تھی جہاں کسی یونانی کے ابھی تک قدم بھی نہ گئے تھے۔ یونانی اور بربری کا غیر منصفانہ فرق ختم ہو چکا تھا۔ مشرق نے یونانی تہذیب کو اپنا لیا تھا اور یونان نے ایک عالمگیر صورت اختیار کر لی تھی۔

اندریں حالات آزاد شہری ریاست کا یونانی سیاسی نظریہ متروک اور بے محل ہو گیا۔ شہر میں سے بہتر زندگی مفقود ہو گئی۔ شہری کے لئے سیاسی زندگی میں کچھ جاذبیت باقی نہ رہی۔ ریاست اور فرد کی ہم آہنگی جاتی رہی۔ غیر ملکی اور دُور دراز کی ایک شہنشاہیت نے غلام دُنیا کی زندگیاں اور قسمتیں ناقابل تعرض طریقہ پر ختم کر ڈالیں۔ ریاست کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہو گیا۔ مگر شخصی دائر مختصر اور محدود ہو گیا آزادی اور خود مختاری جاتی رہی اور زندگی میں سیاسیات کیساتھ زیادہ دلچسپی باقی نہ رہی

یونانی سیاسی نظریہ نے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق کس طرح تبدیلیاں اختیار کیں؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض ایسے سیاسی مفکر تھے جنہیں یا تو یہ تبدیلیاں دکھائی ہی نہ دیتی تھیں اور یا وہ انہیں دیکھنے سے انکار کرتے تھے۔ وہ یہی کہہ رہے تھے کہ شہری ریاست کو اسکندر کے جانشینوں کے عہدِ حکومت میں بھی وہی آزادی حاصل ہے۔ جو ایرانی جنگوں کے زمانہ میں موجود تھی۔ ہرقلیدس اور پونٹیکس کی قسم کے فلاطونیوں اور طیوفرسٹس کے سے ارسطاطالیسیوں کے درمیان ابھی تک ریاست اور فرد، اشتمالیت (مال کو قوم کی مشترکہ ملک بنانے کا اصول جس کی رو سے ہر فرد کو حسب قابلیت اور حسب ضرورت حصہ دیا جائے) اور شخصی ملکیت، اور اشرافیت و جمہوریت کی قسم کے مسائل پر بحث جاری تھی۔ ان فرسودہ فلسفیوں کی قدامت پسندی کا اندازہ لگانا آسان ہے۔ یہ حقائق کے مقابلہ کے لئے تیار نہ تھے۔ یونان کے علمِ سیاسیات صرف فلسفۂ ریاست ہی پر مشتمل نہ تھا۔ یونانیوں کے نزدیک ریاست، سماج، فرد ایک دوسرے سے وابستہ اور متشابہ تھے۔ چنانچہ ان کا علم سیاست موجودہ علمِ سیاست سے زیادہ وسیع تھا اور فلسفۂ حیات، اخلاقیات، مابعد الطبیعیات اور دینیات کو محیط تھا۔ یونانیوں کا کوئی مندر ریاست سے جُدا نہ تھا اور ان کا کوئی بھی مذہب سیاسیات سے علیحدہ نہ تھا۔ اس لئے ان کی تمام تر سماجی، اخلاقی، اور مذہبی سرگرمیوں کے لئے جنہیں آج کل سیاسیات سے علیحدہ ادارے سمجھا جاتا ہے شہری ریاست ایک مرکزی نقطہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ شہری ریاست کا نظریہ صدیوں سے رائج تھا اور اس کا اثر بڑی مشکلوں کے بعد زائل ہوا۔

شب گرفتہ اور ظلمت پسند فلاطونیوں اور ارسطالیسیوں کے علاوہ چند اشخاص ایسے بھی تھے جو حقائق کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے اور سیاسی فلسفہ کو اسکندری عہد سے بعد کے واقعات کے مطابق ڈھالنے کے خواہشمند تھے۔ ان میں سے اپیکیوریس (یونانی حکیم اپیکیورس سنہ ۳۴۱ ق م کے پیرو۔ اس حکیم نے انسانی افعال کا منتہائے مقصود حصولِ لذت قرار دیا تھا) اور رواقی (رواقیت[1] کا فلسفہ زینو نے سنہ ۳۰۰ ق م میں، ایتھنز میں قائم کیا تھا۔ اس میں صرف نیکی زندگی کا مقصد قرار دی گئی تھی اور جذبات کو ضبط کرنے اور لذت و الم کے احساس سے آزاد ہو جانے کی تعلیم دی جاتی تھی) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اب ہم ان کی طرف توجہ کرتے ہیں مگر اس سے پہلے ہم یہ بتلا دینا چاہتے ہیں کہ اسکندر اعظم نے جو شہنشاہی قائم کی تھی چونکہ وہ اسے مستحکم و مضبوط نہ کر سکا تھا اس لئے اسکی موت کے جلد ہی بعد اس کے حصے بخرے ہو گئے۔ کچھ عرصہ تک اس سلطنت کے تین بڑے بڑے حصوں۔ مقدونیہ، شام اور مصر نے اپنا ایک کمزور مگر علیحدہ وجود قائم رکھا۔ لیکن آخرکار یہ سب۔ مقدونیہ سنہ ۱۴۶ ق م میں، شام سنہ ۶۴ ق م میں، اور مصر سنہ ۳۰ ق م میں رومی حکومت کے ماتحت آ گئے۔ یونان بھی مقدونیہ کے ساتھ ہی روما نے فتح کر لیا۔ درحقیقت روما ہی اسکندر کا صحیح جانشین اور اس کی حکمت عملی کا صحیح پیرو تھا۔ روما بھی مقدونیہ کی طرح یونانی اثر قبول کر چکا تھا اسکی تہذیب یونانی تھی۔ اسکی تہذیب یونانی تھی۔ اسکی زبان، اس کا ادب، اور قانون، اسکے فنونِ لطیفہ اور سیاسی نظریات ـــــ سب کے سب اُسی تمدن سے متاثر ہوئے تھے۔ جس کا منبع ایتھنز اور مبلغ اسکندر تھا۔

(۲) اپیکیوریسی اور رواقی

اپیکیوریسیوں اور رواقیوں کو اس امر کا اعتراف تھا کہ کسی وقت آزاد شہری ریاست کا نظریہ کامیاب تھا۔ لیکن وہ یہ کہتے تھے کہ وہ زمانہ اب ختم ہو چکا ہے اور سیاسی زندگی میں ہر اچھے شہری کے لئے کشش نہیں رہی۔ اُن کا خیال ہے کہ ریاست اور فرد کی ہم آہنگی ختم ہو چکی ہے اور دوبارہ قائم نہیں ہو سکتی۔ ان کے نزدیک اچھی زندگی کا مطلب سیاسی مسائل سے گریز و اجتناب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان خیالات کا اقرار اپیکیوریس (سنہ ۲۷۰-۳۴۰ ق م) اور رواقی مکتبِ خیال کے بانی زینو (سنہ ۲۶۰-۳۴۰ ق م) دونوں کے لئے آسان تھا کیونکہ ایتھنز کو اگرچہ انہوں نے وطن بنالیا تھا اور دونوں یہیں تعلیم دیتے تھے مگر ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی شہری ریاست کا باشندہ نہ تھا۔ اپیکیوریس جزیرہ ساموس میں پیدا ہوا۔ اُنیس سال کی عمر میں ایتھنز چلا آیا۔ اور فلاطونی مدرسہ میں داخل ہو گیا۔ اُس وقت افلاطون کی وفات کو پچیس سال ہو چکے تھے اور سکندر کے درخشاں مگر عارضی عہدِ حکومت کے المناک خاتمہ کو ایک سال گزر چکا تھا۔ زینو اس سے بھی زیادہ دور دراز علاقہ کا تھا۔ اسکے باپ کا نام فونیشین اور اس کا وطن سائپرس تھا۔ اسکے ذریعے یونانی فلسفہ میں ایک خاصہ مشرقی عنصر داخل ہو گیا۔ اپنی سیاسی تحقیق کے دوران میں اس نے شہری ریاست کو چھوا تک نہیں۔

اپیکیوریس نے افلاطون اور ارسطو کے نظریات کو ترک کر کے انفرادیت (اس نظریہ کی رو سے فرد کو ہر طرح کی آزادی ہونی چاہئے) کو قبول کیا۔ اور سوفسطائیوں کے مذہبِ لذّتیت (یہ عقیدہ کہ انسان کا مقصدِ زندگی حصولِ لذّت ہے) اور فلسفۂ افادیت (یہ اصول کہ جو کام اپنے لئے مفید ہو وہی اچھا ہے) کی طرف رجوع کیا۔ اس نے یہ تعلیم دی کہ صرف فرد کی شخصیت ہی اہمیت رکھتی ہے، مسرّت زندگی کا منتہا ہے اور ریاست اس مسرّت کے حصول کا صرف ایک ذریعہ ہے ریاست ایک مصنوعی چیز ہے جس کی بنا معاہدۂ عمرانی یا رسم و رواج پر ہے۔ قانون کا مقصد محض افادی ہے۔ انصاف کی کوئی خارجی زندگی نہیں۔ مذہب صرف ایک من گھڑت افسانہ ہے جو انسانیت پر زبردستی ٹھونسا گیا ہے۔ اگر حکومتیں اتنی مضبوط اور مستحکم ہوں کہ وہ امن و امان قائم کر کے ایک فرد کو حصولِ مسرّت کے لئے کوشاں ہونے کے قابل بنا سکیں تو ان کی اقسام ناقابلِ توجہ ہیں۔ اپیکیوریسی معاملاتِ عامہ میں بالکل دخل نہیں دیتا اور اس کا رجحانِ طبع صرف اپنی ذات کیلئے راحت و آرام حاصل کرنے کی طرف ہے۔ اُس کے مسلک کو بالکل برا نہیں کہا جا سکتا استکمالِ نفس، نفس پرستی کے مترادف نہیں۔ مگر اپیکیوریسیت کا عملی نتیجہ عموماً بدترین بد اخلاقی اور سماجی فرائض سے مکمل انکار ہوا ہے چنانچہ اپیکیوریسیت رومیوں کیلئے چنداں جاذب نظر ثابت نہیں ہوئی کیونکہ ان کی روایات کی وجہ سے سماجی فرائض کا احساس انکی گھٹی میں پڑا تھا۔ لکریشیس کی مشہور نظم اور ہوریس کے مختلف اشعار ہی لاطینی علم ادب میں اپیکیوریسی فلسفہ کی تائید کرتے ہیں۔

رواقیت نے روما میں بہت مقبولیت حاصل کر لی تھی — جتنی مقبولیت اس نے یونان میں حاصل کی تھی اُس سے بھی زیادہ — یہ ایک عمدہ، بلند اور سخت گیر مسلک تھا۔ اس نے سینیکا اور مارکس آریلیئس کے سے سلطنت روما کے بلند دماغوں کو بھی اپنا سرگرم حامی بنالیا تھا۔ یہ مسلک عیسائیت سے بہت ملتا جلتا تھا اور اس نے سینٹ پال کی تبلیغ کیلئے راستہ صاف کر دیا تھا۔ رواقیوں نے حصولِ مسرّت کی بجائے فرض کی ادائگی کو اپنا مطمع نظر قرار دیا۔ وہ تسکین و امن کے متلاشی تھے مگر اپنی تمام تر خواہشات کی تکمیل کے ذریعے نہیں بلکہ اپنی خواہشات کو کم کر کے ان کے نزدیک زندگی نفس کشی اور ریاضت کا نام ہے اور خارجی معاملات چنداں اہم نہیں کسی شخص کا غلام یا مطلق العنان شہنشاہ ہونا ان کے لئے کچھ اہمیت نہ رکھتا تھا۔ یہ مسلک نہ تو انفرادیت پسند تھا، نہ قومی اور نہ بین الاقوامی۔ بلکہ ایک صلح کل مشرب تھا۔ اسکے خیال کے مطابق تمام انسان ایک واحد اور ناقابلِ تقسیم اکائی ہیں۔ رواقی ایک آدمی کو شہروں کی مخلوق نہیں سمجھتا بلکہ ایک ہم نسل قوم کا رکن سمجھتا ہے۔ وہ مساوات کا قائل ہے اور ریاست کو صرف اسی وقت قدرتی سمجھتا ہے جب یہ عالمگیر ہو — جیسا کہ سلطنت روما کی آرزو تھی۔ اگر ریاست محدود اور قطعہ داری ہو تو وہ ریاست اسکے نزدیک محض بناوٹی اور رسمی ہے۔ وہ قانون قدرت کا قائل ہے جو مستقل اور اٹل ہے اور جس کے احکام تمام دنیوی قوانین سے

فوقیت رکھتے ہیں۔ وہ انصاف کو قانونِ قدرت کا ایک حکم سمجھتے ہوئے اُس کی تعظیم کرتا ہے اور اُسے خارجی، دائمی، غیر متغیر اور عالمگیر سمجھتا ہے اُسکے نزدیک مذہب کا مطلب نفسِ ناطقہ کی اطاعت اور ہر اُس فرض کی کما حقہٗ آدائگی ہے جسے ضمیر لازمی قرار دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ قدرت اور قوانینِ قدرت کی تہ میں نفسِ ناطقہ ہی کارفرما ہے۔ دیوتاؤں کا وجود یا عدم وجود اسکے لئے کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ اگر ان کا کوئی وجود نہیں ہے تو وہ ان کے بغیر بھی گزارہ کرسکتا ہے۔ اگر ان کا کوئی وجود ہے تو وہ جو سزا اُسے دیں وہ بھگتنے کیلئے تیار ہے۔

جن لاطینی رواقیوں نے سیاسی تحقیق و مطالعہ کیا ہے اُن میں سینیکا (۳ ق م ۔ ۶۵ء) کو عظیم ترین اور ناقابلِ انکار حیثیت حاصل ہے۔ پیشتر ازیں کہ ہم اس کا اور اسکے بعد آنے والے اہم رومی فقہا کا جو تقریبًا سب کے سب رواقی ہیں ذکر کریں اُن دو مفکّروں کے سیاسی نظریات کا مطالعہ لازمی ہے جو اُس سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ یعنی پولیبیس (۲۰۴-۱۲۲ ق م) اور سسرو (۱۰۶-۴۳ ق م) مؤخرالذکر کچھ حد تک رواقی فلسفہ کے زیرِ اثر تھا۔

(۳) روما کے سیاسی مفکّرین

روما کا پہلا سیاسی مفکّر پولیبیس تھا اور لطف کی بات یہ ہے کہ وہ بھی یونانی تھا۔ وہ سولہ سال تک (۱۶۷-۱۵۱ ق م) روما میں ایکیائی جمعیتہ .... (ACHALAN LEAGNE.) کے یرغمال کے طور پر رہا۔ اس قیام کے دوران میں وہ رومی طرزِ حکومت کا مدّاح اور رومی عروج کا راز معلوم کرنے کا مشتاق ہو گیا (یہ یاد رہے کہ روما ایک زمانہ میں شہری ریاست تھی جسے ایتھنز یا سپارٹا پر کچھ فوقیت حاصل نہ تھی) کیونکہ اسکے برعکس یونان کی شہری ریاستیں بہت بُری طرح ناکام ہو چکی تھیں۔ چنانچہ اس نے تاریخِ روما کا غائرانہ اور مفصل مطالعہ کیا۔ اسکے بعد اس نے ایک گراں بہا اور یادگار کتاب لکھی جس میں اُس نے کارتھیجی جنگوں کے آغاز سے لیکر اپنے زمانہ تک کے تعجب انگیز طور پر بڑھتے ہوئے رومی وسعت و اقتدار کے مختلف مدارج بیان کئے اپنی اس تاریخ کے ایک باب (کتاب ششم) میں اُس نے اُن اصولوں کے فلسفیانہ تجزیہ کی کوشش کی ہے جنہوں نے رومی آئین کو عدیم النظیر طریقہ پر مستحکم اور مضبوط کر دیا تھا۔ ارسطو نے ریاست کو بادشاہت اشرافیت اور جمہوریت میں تقسیم کیا ہے۔ اس تقسیم سے پولیبیس نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان ہر سہ اقسام کا اختلاف اندرونی اور اصولی نہیں بلکہ بیرونی اور اداری ہے اور یہ اختلاف متضاد قوّتوں کی بنا پر ہے متضاد اصولوں کی بنا پر نہیں۔ وہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ان تینوں میں سے کسی کی بھی اصلی حالت مستقل طور پر قائم نہیں رہتی وہ یہ دکھاتا ہے کہ یونان میں ریاست کی شکل و صورت میں ایک انقلابی تغیّر و تبدّل باقاعدگی اور تیز رفتاری کے ساتھ وقوع پذیر ہوتا رہا ہے۔ اس تغیّر و تبدّل نے مندرجہ ذیل دائرہ کی صورت اختیار کر لی ہے:-

بادشاہت۔ استبدادیت۔ اشرافیت۔ عدیدیت۔ جمہوریت اور حکومت انبوہ۔ اس کے بعد پھر بادشاہت وجود میں آتی ہے اور یہی دائرہ پھر بنتا ہے۔

اسکے نزدیک رومی قوت و استحکام کی وجہ یہ ہے کہ اس کے آئین میں ریاست کی تینوں قسمیں متوازن طور پر باہم مخلوط ہو گئی ہیں۔ قنصل بادشاہت کے اصول کے مظہر ہیں۔ ایوانِ اعلیٰ اشرافیت اور ایوانِ زیریں جمہوریت کے اصولوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ آئینی نظام میں اس نے سب سے پہلے مزاحمت و توازن کا نظریہ شامل کیا۔ اسکے نزدیک ریاست ایک نامیاتی نظام (یعنی ریاست کسی طبعی حرکت کا نتیجہ نہیں بلکہ اس نے مختلف ذریعوں سے نشو و نما پائی ہے) نہیں ہے بلکہ ایک میکانکی اختراع (یعنی ریاست محض طبعی حرکت کا نتیجہ ہے اور بغیر کسی شعوری ارادے کے خود بخود نمودار ہو گئی ہے) اور متضاد قوتوں کی ترتیب و انضباط ہے

پولیبیس روما کے جس استحکام و توازن کا تمنا خواں تھا اس کی زندگی ہی میں اُس کی جگہ جھگڑوں اور ہنگاموں نے لے لی تھی۔ گراشی (۱۳۳ ق م) کی شورشوں نے اشرافیت اور جمہوریت کے درمیان جس صدسالہ جنگ کا آغاز کیا تھا اس کا نتیجہ جمہوریت کا زوال اور شہنشاہیت کا قیام ہوا۔ سسرو کی تصانیف پولیبیس سے ایک صدی بعد کی ہیں اس زمانہ میں جولیس سیزر اپنی فاتح فوج کی مدد سے روما میں ایک شہنشاہی آمریت قائم کر رہا تھا۔ سسرو ایک سرگرم جمہوریت پسند تھا اور سیزر

سے متنفر و خائف تھا۔ وہ ایوانِ اعلیٰ کی عزت اور میجسٹریٹوں کی قوت کے دوبارہ قیام کا خواہاں تھا۔ اپنی کتابوں "جمہوریت" اور "قوانین" میں اس نے ان وجوہات کا جائزہ لیا ہے جو پولیبئس کے خوش اقبال زمانہ کے بعد ہی سے جمہوریت کے المناک زوال کے لئے کوشاں ہو گئی تھیں۔ پولیبئس توازن کو استحکام کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ اس نظریہ کے ماتحت سسرو نے یہ ثابت کیا ہے کہ اسکے وقت کی شورشیں اور مصیبتیں اس وجہ سے ہیں کہ جمہوری عنصر کو بہت زیادہ قوت دیدی گئی ہے۔ ایک ایسی قوت جس کا ماریس اور سیزر کے سے مقرروں نے ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ سسرو رومی جمہوریت اور اس کے آئین کی خوبیوں کی تعریف میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتا ہے۔ عملی مقاصد کیلئے وہ رومی قانون ——— جو انصاف و معدلت کے اصولوں کے لحاظ سے مضبوط ہے ——— کو رواقی قانونِ قدرت کے مترادف قرار دیتا ہے یہ امر واقعہ ہے کہ علمِ سیاست پر یہ اس کا اہم ترین احسان ہے، کیونکہ یہ نظریہ قانونِ قدرت کو آسمانوں پر سے زمین پر لے آتا ہے اور اسکے آزادی، مساوات اور اخوت کے اصولوں کو بنی نوعِ انسان میں پہلی دفعہ رائج کرتا ہے۔ ۳۸

ایک ادنیٰ شخص کیلئے ایک ریاست کا بچانا ناممکن ہے چنانچہ سسرو نے سیزر اور اسکے بھتیجے آغسطس کی مخالفت کر کے اپنے ہی قتل و بربادی کا سامان پیدا کیا۔ رومی جمہوریت کی جگہ ایک شہنشاہیت نے لے لی تھی۔ اسکے اولین اور بدترین بادشاہوں میں ایک نیرو نامی بھی ہوا ہے۔ آٹھ برس تک (سنہ ۵۴-۶۲ ق م) اس کا اتالیق سینیکا اس کا وزیر رہا۔

نیرو کی وزارت کا عہدہ رواقی دبستان (SCHOOL THONG)[HT] کے سخت ترین پابند فلسفی کیلئے ایک سخت آزمائش تھی۔ تخیل اور حقیقت میں بُعدالمشرقین کی وجہ سے یک جہتی ناممکن تھی۔ ایک طرف تو رواقی فلسفہ کی تعلیم تھی کہ دورِ جاہلیہ کا غیر ترقی یافتہ اور جاہل انسان بھی معصوم اور مسرور تھا، اس دور میں قانون قدرت ہر شخص کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا ہر شخص اسکی اطاعت کرتا تھا اور قانونِ قدرت نے اس دور میں کافی ضبط و نظم قائم کر رکھا تھا، نہ شخصی ملکیت تھی، نہ غلامی اور نہ کوئی حکومت، بلکہ آزادی، مساوات اور اخوت کا دور دورہ تھا۔ دوسری طرف نیرو کی شہنشاہیت تھی جس میں غیر معمولی بدعملی، عظیم ترین جرائم، وسیع مصائب جبر و تشدد، عدم مساوات، کثیر ترین غلامی اور خوفناک عداوتیں خانہ جنگی کا باعث ہو رہی تھیں۔ اگرچہ یہ بادشاہت بری تھی، مگر اس نراجی ابتری سے اچھی تھی جو اس حکومت کے خاتمہ پر یقینی تھی۔ اس لئے سینیکا اور اسکے سے دوسرے اشخاص اس شہنشاہیت کے حامی و معاون تھے انہیں اس امر کا احساس تھا کہ انہیں دو برائیوں میں سے ایک برائی منتخب کرنا ہے ——— استبدادیت یا فوضویت (فوضویت کو نراج بھی کہا جاتا ہے ——— اس نظام میں کوئی حکومت نہیں ہوتی اور ہر شخص بذاتِ خود اپنے لئے قانون ہوتا ہے۔ انارکزم اسی کا نام ہے) ——— اور وہ اول الذکر کو ترجیح دیتے تھے۔ کیونکہ استبدادیت میں ضبط و نظم قائم رکھا جا سکتا تھا اور یہ بایانِ کار نراج سے کم جابر تھی لیکن زمانہ کے حالات قابو سے باہر ہو چکے تھے اور ان میں کسی قسم کی اصلاح کی امید نہ تھی۔ اس لئے اس رواقی (سینیکا) نے عزلت نشینی اختیار کر لی اور موت کا انتظار کرنے لگا کہ وہ آکر اسے ان جھمیلوں سے خلاصی دلائے یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ رواقیوں کے نزدیک اُس معیاری طرزِ حکومت میں جو دورِ جاہلیت میں قائم تھی (اگر انسان اچھے بن جائیں تو یہ نظامِ حکومت دوبارہ بھی قائم ہو سکتا ہے) اور عملی طرزِ حکومت میں (جو انسانی کمزوریوں اور غلطیوں کا لازمی نتیجہ ہے) جو اختلاف ہے وہ عیسائی اسقفوں کیلئے اس وقت بہت مفید ثابت ہوا۔ جب انہیں احکامِ اناجیل کو نئے عیسائی شدہ متذبذب بزنطینی شہنشاہوں کے اعمال و افعال کے مطابق ڈھالنا پڑا۔

سینیکا کے ہمعصر فقیہوں اور اسکے بعد قسطنطین (سنہ ۳۰۶-۳۳۷ء) کے زمانہ تک کے متعدد فقیہوں نے ——— جو تقریباً سب کے سب رواقی تھے ——— فلسفہ کے اصولوں کو رومی قوانین پر عائد کیا۔ انہوں نے قانونِ قدرت کے رواقی نظریہ کو ——— یہ قانون قدرت دراصل تعلیم یافتہ ضمیر اور عقلِ سلیم کے احکام پر مشتمل ہے۔ روما کے شہری قانون کو بلند و مطہر اور بین الاقوامی قانونِ جنگ کو وسیع کرنے کیلئے استعمال کیا۔ قانونِ قدرت کے اصولوں نے غلامی کی سختیوں اور پابندیوں میں تخفیف اور نرمی کر دی جیسا کہ الپئین نے ...

ایشیا جون جولائی سنہ ۱۹۴۲ء

سید مظفر برنی

اُردو شاعری کے نئے میلانات

زمانہ اور ادب کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادب زمانہ سے متاثر ہوتا ہے اور زمانہ ادب سے اثر قبول کرتا ہے۔ ادب زمانہ کا آئینہ ہے۔ تو زمانہ ادب کا پرتو ہوتا ہے۔ ادب زمانہ سے بے نیاز نہیں ہو سکتا اور زمانہ ادب کا دامن نہیں جھٹک سکتا۔ اسی لئے کسی زمانہ کے ادب کا جائزہ لینے کے لئے اس وقت کے مخصوص حالات اور رجحانات پر نظر غائر ڈالنا ضروری ہے۔

آج بیسویں صدی میں دو زبردست رجحانات کرۂ ارض پر چھائے ہوئے ہیں۔ ایک اشتراکیت دوسرا جمہوریت۔ اول الذکر اُنیسویں صدی کے صنعتی دور اور اسکے نتیجے سرمایہ دارانہ نظام کے ردعمل کا نتیجہ ہے اور مؤخر الذکر بنی نوع انسان کے خواب آزادی کی مبہم سی تعبیر ہے۔ ان دونوں رجحانات کا اثر عالمگیر ہے۔ اشتراکیت اور جمہوریت کی انتہا پسند صورت یہ ہے کہ یہ دونو "قدیم" کے خلاف "جدید" کی حامی ہیں۔ گویا رجعت پسندی اور قدامت پرستی کی مکمل ضد ہیں۔ یہاں تک کہ ہر وہ اچھی یا بُری چیز جو کسی صورت سے بھی زمانۂ ماضی سے منسوب ہے زمانۂ حال کی ان تحریکوں کی زد میں آجاتی ہے۔ جنگِ عظیم نے ان تحریکوں کو ایک نیا جوش، ایک نئی سرگرمی اور ایک نئی زندگی بخشی لیکن ہر تحریک ایک ایسے دور سے گزرتی ہے جب ترقی پسند قوتیں ۔ ۔ ۔ (REVOLUTIONARY FORCES.) رجعت پسند قوتوں (REACTIONARY) سے برسرِ پیکار ہو جاتی ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ دونو ایک دوسرے کی ٹکّر کی ہوتی ہیں۔ اس لئے جلد ایک دوسرے پر غالب نہیں آسکتیں۔ اس وقت بنی نوع انسان ایک تذبذب کے عالم میں ہوتے ہیں۔ چونکہ کوئی فریق کامران و کامیاب نہیں ہوتا اس لئے وہ آگ پانی کی سی مخالف فریقوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں وہ ایک ایسے دوراہے پر کھڑے ہوتے ہیں جہاں سے کبھی وہ مُڑ کر اسی راستے کو دیکھتے ہیں جس سے یہاں تک آئے ہیں۔ اور کبھی ایک امید افزا شوق اور ایک شوق افزا امید کے ساتھ نئے راستے پر نظر ڈالتے ہیں۔ ہمارے زمانہ کی ہو بہو ایسی ہی کیفیت ہے۔ آمریت جو ملوکیّت کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے جمہوریت سے برسرِ پیکار ہے۔ سرمایہ داری اشتراکیت سے دست و گریباں ہے ایک عام بے اطمینانی اور بے چینی کا عالم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی بے تحاشہ دوڑتے ہوئے تھک گئی ہے۔ اور پھر کبھی حالتِ جمود سے اُکتا کر دوڑنا شروع کر دیتی ہے۔ ایک ہیجان ایک اضطراب بے تحاشہ دوڑنے پر اکساتا ہے۔ لیکن پھر ایک قسم کی افسردگی اور دل برداشتگی ہمارے قدم پکڑ لیتی ہے۔ تاریکی دور ہوتی جاتی ہے۔ دور بہت دور افق پر ایک نئی صبح کے انوار نمایاں ہیں۔ خدا جانے یہ صبح کاذب ہے یا صبح صادق۔ آنکھوں پر سے غفلت کے پردے اُٹھتے جا رہے ہیں۔ اعتقاد عقل کے سامنے سر جھکا رہا ہے مسلمہ باتیں تنقید کی کسوٹی پر پرکھی جا رہی ہیں۔ حتیٰ کہ خدا کا عدم یا وجود بھی معرضِ بحث میں پڑ گیا ہے۔ غرضیکہ یہ "دورِ طلسم شکنی" (DISILLVSION MENT.) ہے۔

جب ہم اُردو کی جدید شاعری پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا شعر و ادب بھی رفتارِ زمانہ کے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کر رہا ہے اگرچہ کہیں کہیں اور کبھی کبھی اس دوڑ میں پیچھے رہ جاتا ہے۔ تمام جدید شاعری کا ماحصل یہ ہے کہ یہ زندگی اور فطرت سے قریب تر ہوتی جارہی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ اُردو شاعری الفاظ سے کھیلتی تھی۔ پھر ایک ایسا زمانہ آیا کہ جذبات و احساسات سے بھی کھیلنے لگی۔ لیکن اب وہ زمانہ آگیا ہے کہ ہماری شاعری زندگی اور فطرت دونو سے کھیلتی ہے۔ زندگی اور فطرت جو خود ایک کھیل ہیں۔ پہلے شاعری زندگی کا ایک کھیل سمجھی جاتی تھی۔ اب زندگی شاعری کا کھیل بن گئی ہے۔ اٹھارہویں اور اُنیسویں صدی میں ہماری زندگی انفرادی تھی۔

لیکن بیسویں صدی میں ہماری زندگی انفرادی کی بجائے اجتماعی ہوگئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ کی شاعری کا داخلی پہلو (SUBJECTIVE)

خارجی پہلو (OBJECTIVE.) پر غالب تھا اور جدید شاعری کا داخلی پہلو خارجی پہلو سے ہم آہنگ ہے۔ بلکہ جدید شاعری داخلیت اور خارجیت کا ایک حسین سنگم ہے۔ ہماری انفرادی زندگی صرف جذبات و احساسات کا نام ہے لیکن اجتماعی زندگی سیاست، اقتصادیات اور معاشرت وغیرہ سے عبارت ہے۔ اسی لئے آج حریمِ سخن میں سیاست، معاشرت، مذہبیت وغیرہ بھی باریاب ہیں۔

وقت کے ساتھ ساتھ ہمارے تصوّرات بھی بدل گئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہماری شاعری میں زندگی کے نئے تصوّرات، سیاست کے نئے عقدے تمدّن کے نئے مسائل، قوم و ملک کی بہبودی کے نئے نظریے دعوتِ فکر دے رہے ہیں۔ میں اُردو شاعری کے اس دور کو "انقلابی دور" کہونگا۔ نہ صرف زبان و بیان بلکہ موضوعات و مضامین میں ایک زبردست انقلاب ہوگیا ہے ہماری شاعری پرانی مسموم فضا چھوڑ کر ایک نئی کھلی فضا میں سانس لے رہی ہے۔ غرض یہ ہے کہ شاعری کا نہج بدل کر رہ گیا ہے۔ اس ڈرامائی تغیّر و تبدّل کا اندازہ مندرجہ ذیل شعروں سے ہوگا۔ غالب کا ایک شعر ہے ؎

نے تیر کماں میں ہے نے صیّاد کمیں میں
گوشہ میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

یہ شعر نہ صرف اس وقت کی عام ذہنیّت کا آئینہ دار ہے بلکہ روحِ عصر کا بھی ترجمان ہے۔ آج زمانہ اور ماحول بدل لینے سے یہی مضمون اس سانچہ میں ڈھل گیا ہے ؎

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں
وہ گلستاں کہ جہاں تاک میں نہو صیّاد (اقبالؒ)

زندگی کی مردانہ جدوجہد جو ہمارے زمانہ کا مسلک ہے۔ اس شعر سے نمایاں ہے۔ دیکھئے ہماری شاعری اجتماعی زندگی سے کتنی قریب آچکی ہے اور زمانہ کے اثرات کہاں تک قبول کر رہی ہے ؎

بنا لیتا ہے موجِ خونِ دل سے آشیاں اپنا [1]
وہ پابندِ قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے (اصغر گونڈوی)

[1] اصغر صاحب جدید شعراء میں سے تو نہیں ہیں؟! وہ صوفی شاعر ہیں اور قدیم وقیانوسی متصوفانہ خیالات ان کی شاعری کی جان ہیں۔ ادارہ

وہی قفس وہی آشیاں وہی چمن لیکن الفاظ کے اس روایتی ڈھانچے کے اندر آزادی کی وہ روح دوڑا دی ہے کہ یہ شعر ہماری قومی ذہنیت کی صحیح اور سچی تصویر بن گیا ہے۔

جدید شاعری کا اوّلین رجحان انقلاب کی جانب ہے۔ جنگِ عظیم کے بعد ہندوستان کے سیاسی مطلع پر کبھی دھواں دھار ابر چھایا کبھی طوفان خیز آندھیاں چڑھیں۔ کبھی جھکڑ آئے۔ کبھی بگولے اُٹھے۔ غرض ایک عام بےچینی اور حرکت و حرارت پیدا ہوگئی۔ روحِ جمہور موجودہ سماج اور حکومت سے بیزار ہوگئی۔ انقلاب کی ایک لہر تمام ملک میں دوڑ گئی۔ اسی تغیّر و تبدّل کا اثر ہمارے شاعروں پر بھی پڑا ؎

جو ایک ایسا آئینہ ہیں شاہراہِ وقت پر
چہرۂ ہستی کے خال و خد ہیں جس میں جلوہ گر
اُڑ رہے ہیں جن کے پرچم آب و گل کے قصر پر
جن کی بینا اُنگلیاں رہتی ہیں نبضِ عصر پر (جوش ملیح آبادی)

ہمارے شاعر جو ابتک کوچۂ یار کو اپنی دُنیا سمجھتے تھے جو میخانہ کو جنّت جانتے تھے جو "جامِ آتشیں" کو حاصلِ کونین مانتے تھے۔ جو دربان کے قدموں میں سربسجود رہنا عبادت خیال کرتے تھے۔ جو مقتل کو تفریح گاہ گردانتے تھے۔ جو محبوب کے تصوّر سے سر اُٹھانا گناہ خیال کرتے تھے جو حریمِ ناز میں باریابی کو معراج سمجھتے تھے۔ جن کی قیمتی زندگی کا مصرف صرف یہ تھا۔ ع

بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کئے ہوئے

جن کے زنانہ پن کی حد یہ تھی کہ نازک اندام محبوب کے ہاتھ میں خنجرِ آبدار و تیغِ جوہر دار دیکر اپنی سخت جانی اور ان ہتھیاروں کی "نسوانیت" کا مظاہرہ کریں جو تیغ و کفن باندھنا صرف اس لئے ضروری خیال کرتے تھے کہ۔ عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا۔ جن کی آواز زیرِ لب آہوں اور زبان دلسوز نالوں کیلئے وقف تھی۔ وہ بھی آج زمانہ اور ماحول کے اثرات سے بیگانہ نہیں۔ وہ بھی موجودہ تمدّن سے بیزار ہیں۔ وہ بھی تہذیبِ حاضر سے متنفر ہیں۔ وہ بھی ظالم و جابر حکومت کا تختہ اُلٹ دینے کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ وہ اس دُنیا کو نیست و نابود کر کے ایک نئی دُنیا۔ اپنے خوابوں کی دُنیا بنانا چاہتے

ہیں۔ وہ موجودہ فرسودہ نظام کو مسمار کر کے اس کی بنیادوں پر ایک نیا نظام بنانے پہ تُلے ہوئے ہیں۔ اب وہ فردوس گوش نغمات کے متحمل نہیں۔ انہیں تلواروں کی جھنکاروں میں موسیقی کی لذت حاصل ہوتی ہے۔ اب طبلِ جنگ کی صدا پر ان کی روحیں رقص کرنے لگتی ہیں اب وہ مقتل میں خونِ بسمل کے رقص کی دعوتِ تماشا نہیں دیتے۔ بلکہ انقلاب کے وقت خون کی ندیاں بہانا چاہتے ہیں۔ اب ان کے لب نے نوازی میں مست نہیں بلکہ صور پھونکنے کے لئے وقف ہیں۔ اب ان کی آنکھوں میں شراب کا خمار نہیں بلکہ غیض و غضب کے شعلے دہک رہے ہیں۔ اب ان کی آواز روحِ انسانی میں انبساط کی لہر نہیں دوڑاتی بلکہ اضطراب کے مد و جزر پیدا کرتی ہے۔ سماج سے بغاوت، حکومت سے بغاوت، مسلمہ امور سے بغاوت، موجودہ حالات سے بغاوت غرض بغاوت ان کی شاعری کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ہماری موجودہ شاعری کی تہ میں انقلاب کی روح کار فرما ہے۔ ایک ایک شعر کسی نامعلوم جذبہ بغاوت، کسی مبہم تمنائے تغیر، کسی اندرونی درد و کرب سے کپکپا رہا ہے۔ آج ہر شاعر جوش سے ہم آہنگ ہو کر یہ نعرہ لگا رہا ہے[۱]

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب

میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب (جوش)

علامہ اقبال رح نے بھی جو قطعاً جدید شعرا (ULTRA MODERN POETS) کے تحت میں نہیں آتے اس انقلاب کی کارفرما قوت کا اندازہ لگا لیا تھا چنانچہ فرماتے ہیں

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب

از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

انقلاب

انقلاب اے انقلاب

جوش کی "بغاوت"۔ مجاز کی "آوارہ"۔ علی سردار جعفری کی "حالِ مستقبل"۔ شہاب ملیح آبادی کی "انقلاب کی پکار"۔ احسان کی "باغی کا خواب" اور اسی قسم کی دوسری نظمیں ایک ناگزیر انقلاب کی خبر دے رہی ہیں۔

مجاز کی نظم "آوارہ" کے چند بند سنئے۔ معلوم ہوتا ہے موجودہ سماج کی بدعنوانیاں۔ سرمایہ داری کی سفاکیاں، امراء کی عیاشیاں۔ غربا کی مجبوریاں شاعر کے دل و دماغ میں ایک طوفان بپا کر رہی ہیں۔ وہ سماج کی زنجیروں کو توڑنا چاہتا ہے وہ نام نہاد اخلاقی قوانین سے منہ موڑتا ہے کہ ان ہی کے پردے میں اخلاق سوز بدکاریاں روا رکھی جاتی ہیں۔ وہ حکومت کا تختہ الٹنا چاہتا ہے کہ یہی تمام برائیوں کی جڑ ہے

رات ہنس ہنس کے یہ کہتی ہے کہ میخانہ میں چل

پھر کسی شہ ناز لالہ رخ کے کاشانے میں چل

یہ نہیں ممکن تو پھر اے دوست ویرانے میں چل

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب

جیسے ملا کا عمامہ جیسے بنیے کی کتاب

جیسے بیوہ کی جوانی جیسے مفلس کا شباب

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

لے کے اک چنگیز کے ہاتھوں سے خنجر توڑ دوں

تاج پر اس کے دمکتا ہے جو پتھر توڑ دوں

کوئی توڑے یا نہ توڑے میں ہی بڑھ کر توڑ دوں

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندر سبھا کا ساز و ساماں پھونک دوں

اس کا گلشن پھونک دوں اس کا شبستاں پھونک دوں

تختِ سلطاں کیا میں سارا قصرِ سلطاں پھونک دوں

اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

سماج سے بیزاری، حکومت سے نفرت، موجودہ حالات سے بے اطمینانی کبھی بغاوت کا رجائی جذبہ اور کبھی روگردانی کا متشائم جذبہ پیدا کرتا ہے۔ جاں نثار اختر مجاز کی طرح مقابلہ کی تاب نہیں لاتا۔ وہ اس کشمکش سے تھک کر اس کو بھول جانا چاہتا ہے اور بے اختیار کہہ اٹھتا ہے۔ ع دوست! سب کچھ بھول جانے دے مجھے

اس وقت فطرت کے روح پرور نظارے بھی حزن و افسردگی کے مرقع نظر آتے ہیں *

---

[۱] جوش سے نہیں وقت سے ہم آہنگ ہو کر۔

یہ ستارے یہ کفن کے سرد پھول
آسماں جیسے جلی لاشوں کی دھول
چاند گویا ایک بے امت رسول
دوست سب کچھ بھول جانے دے۔ مجھے

انقلاب کا اثر یہاں تک نمایاں ہے کہ ایک رومانی شاعر بھی ساقی سے خطاب کرکے کہتا ہے ؎

یہ کس نے کھٹکھٹایا آج میخانے کا دروازہ
ہر ایک مے کش یکایک بے پیے برہم اٹھا ساقی
یہ کیسا مے کے بدلے خون چھلکا تیرے شیشے سے
یہ کیسا ساز سے اک نغمۂ ماتم اٹھا ساقی
بغاوت کی ہوائیں چل اٹھیں شاید گلستاں سے
یہ پیمانے الٹ ساقی یہ جام جم اٹھا ساقی
جو ممکن ہو تو بھی آج رنگیں جام کے بدلے
لہو کے رنگ میں ڈوبا ہوا پرچم اٹھا ساقی
(جاں نثار اختر)

زمانے کے تغیرات دیکھیے کہ ساقی جو کبھی نزاکت و لطافت کا پیکر "ایمان و آگہی" کا دشمن خیال کیا جاتا تھا جس کا کام مے پلانا اور مست کرنا تھا۔ آج اس سے "لہو کے رنگ میں ڈوبا ہوا پرچم" اٹھانے کی درخواست کی جاتی ہے۔ آج جبکہ ہر کس و ناکس کے دل میں انقلاب کے جذبے ابھر رہے ہیں۔ بغاوت کے ولولے نشو و نما پا رہے ہیں شاعر جو عام سطح سے بلند جو عوام الناس سے زیادہ حساس ہوتا ہے اس کے دل و دماغ میں ایک طوفان بپا ہے کہیں یہ طوفان "باغی کے خواب" دکھاتا ہے۔ کہیں یہ حرمان زندگی و بیچارگی کا احساس پیدا کرتا ہے جیسا کہ مجاز اور اختر کے محولہ بالا اشعار سے نمایاں ہے۔

لیکن موجودہ انقلابی شاعری پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہمارے شعراء صرف تخریب چاہتے ہیں۔ تعمیر کا کوئی تصور پیش نہیں کرتے نہ غالباً مدنظر ہے۔ اختر اورینوی کا جوش ملیح آبادی پر اعتراض اس نوع کی تمام شاعری پر اعتراض ہے۔ "جوش اتنا سمجھتا ہے کہ اس دور کے بعد بھی حیات و تہذیب کے مظاہر قائم ہوں گے۔ لیکن ان کی شکل و صورت سے اسے کوئی بحث نہیں وہ صرف پہاڑوں کو ڈھانا چاہتا ہے۔ اس کا مقصد جوئے شیر لانا نہیں۔" یہ صحیح ہے کہ ہماری انقلابی شاعری میں آئندہ نظام کا کوئی معقول نظریہ پیش نہیں کیا جاتا۔ لیکن انقلاب کو دماغ کی نسبت دل زیادہ ابھارتا ہے۔ ظاہر ہے جہاں جذبات (SENTIMENTS) کا دور دورہ ہوگا وہاں (SCIENCE) کا گزر نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کے ادب میں کوئی گہرائی کوئی دعوتِ تفکر کوئی نظریاتی (IDEALOGICAL) عنصر نہیں ملتا۔

جدید شاعری بنی نوع انسان سے محبت و ہمدردی کی آئینہ دار ہے ہمارا شاعر تنگ و تاریک جوہڑوں، عفونت بیز گلیوں، ٹوٹے پھوٹے مکانوں جھلسی ہوئی جھونپڑیوں حتیٰ کہ جسم فروشی کی مکروہ دکانوں کا گہری ہمدردی اور سچے احساس سے مشاہدہ کرتا ہے۔ وہ پیٹ کے بل رینگنے والے محتاجوں، سڑک پر گھسٹنے والے بھک منگوں، روٹی کے ایک سوکھے ٹکڑے پر لڑنے والے انسانی درندوں کا نقشہ کھینچ کر ہمارے دلوں کو احساس کی آگ سے پگھلاتا ہے۔ وہ دن بھر خون پسینہ ایک کرنے والے مزدوروں، پتھر کوٹنے والی "شہزادیوں"، قحط زدہ کسانوں، بھوکے ننگے کارخانہ داروں کی عکاسی ایسے خلوص ایسی ہمدردی اور ایسی صداقت سے بیان کرتا ہے۔ کہ ہم اس آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ کر آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں۔ وہ اس فاقہ مستی اور تہیدستی کے ذمہ دار بڑے پیٹ چھوٹے سر اور دل کی جگہ سنگ پارہ رکھنے والے سرمایہ داروں کو ٹھہراتا ہے۔ وہ ان کی ہڈیاں چچوڑنے کے لئے بپھرا ہوا ہے۔ وہ ان دولت کے پجاریوں کو ڈسنے کیلئے سم آمیز پھنکارے مار رہا ہے۔ وہ صنعت و تجارت کے اجارہ داروں کو نیست و نابود کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اب ہماری شاعری امارت کے در پر ناصیہ فرسا نہیں اس میں انسانی مصائب و ابتلا کا گزر بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے دروازے مظلوم فاقہ کش بے بس غریب انسانوں کے لئے بند نہیں ؎

اے بٹاری کے سرکے انگور اہل عز و جاہ — آدمی پر رحم کرنے کو سمجھتے ہو گناہ
اغنیا بے حس خدا غافل حکومت بے عمل — بن رہے ہیں تجھ سے تو ان تینوں کے پھندوں سے نکل

بے حس مظلوموں اور برسر اقتدار ظالموں کے ہجوم میں اپنے آپ کو بے بس

پاتا ہے۔ وہ ایک ایسی دُھن ہیں جس میں مجبوری غضبناکی سے ہم آغوش ہو جاتی ہے۔ کہہ اٹھتا ہے ؎

پڑ نہیں جاتے الٰہی سینۂ دولت میں داغ ۔۔۔ بجھ نہیں جاتے شبستانِ امارت کے چراغ
اپنی تابندہ سے لے سرمایہ داروں ہوشیار ۔۔۔ اپنے تاجوں کی چمک سے تاجدارو ہوشیار
نیلم و یاقوت سے شعلے بھڑک اٹھنے کو ہیں ۔۔۔ سُرخ دیناروں میں انگارے دہک اٹھنے کو ہیں
فرش گل والوں زمیں پر لوگ محو خواب ہیں ۔۔۔ خرمنوں کے پاسبانوں بجلیاں بیتاب ہیں

یہ اس کی باطنی آواز ہے۔ یہ اس کا مستحکم یقین ہے۔ اس کی مبصرانہ پیش گوئی ہے۔

جوش کی "ضعیفہ"، "دو بھو کا ہندوستان"، "حسن اور مزدوری"۔ ساغر کی "بھکارن"۔ احسان کی "بھیک"۔ "مزدور کی موت" وغیرہ نظمیں ہماری شاعری میں اس جدید میلان کی ترجمان ہیں۔ جوش کی نظم "ایک تقابل" کے چند شعر سنئے ؎

مال کا وہ درجہ جس میں بل کے مزدور تھے ۔۔۔ آکے ٹھہرا دوسرے درجے کے بالکل سامنے
اس طرف سامانِ دل تنگی تھا جو طبع کا دھوا ۔۔۔ اس طرف چہروں پہ تھی ٹھنڈی ہوا کی سرخیاں
اس طرف موجِ نفس اک نالۂ بیتاب تھی ۔۔۔ اس طرف تارِ سکوں پر ذہن کی مضراب تھی
آہ ان دونوں میں اک شے مشترک جو پھر نہ تھی ۔۔۔ ان کے چہروں پر چمک تھی انکے چہروں پر نہ تھی
آہ اللہ اس قدر عدل و تناسب کی کمی ۔۔۔ اس طرف بھی آدمی تھے اس طرف بھی آدمی
لیکن اس منزل سے بے ماتم گزر سکتا ہے کون ۔۔۔ جز خدا اس ظلم کو برداشت کر سکتا ہے کون

احسان مستقل طور پر شاعر مزدور کہلاتا ہے۔ اس کی شاعری کا منتہاہی مزدوروں کی شرمناک غربت و بیکسی کی عکاسی کرنا ہے۔ جوش کی شاعری میں یہ جذبہ اس طرح محدود نہیں بلکہ عالمگیر وسعت رکھتا ہے۔ "مظلوم بچّہ" بھی جو "جھکا میدان میں جھاڑو دے رہا ہے یکہ و تنہا" اسکے حریم سخن میں باریاب ہے۔ وہ اسکی نفسیاتی عکس ریزی کیلئے وہ پہلو منتخب کرتا ہے جو ہماری روح میں تیر بن کر اتر جاتا ہے ؎

دمادم جب گلی سے گیند کی آواز آتی ہے
رخِ طفلی پہ اک بیچارگی سی دوڑ جاتی ہے

وہ "چادر کی بھیک" کے بھی خدا سے ملتمس ہے ؎

فقط ہلکی سی اس بڑھیا کو چادر
خدایا! داورا! پروردگارا!

اس کی تمام شاعری میں یہ جذبہ مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے ایک شب کا خاکہ کھینچا ہے۔ اس میں بھی خونِ افلاس سے رنگ بھرتا ہے ؎

سو رہے ہیں جھونپڑے دبکے ہوئے سر ڈال کے ۔۔۔ مفلسی کی تلخ فریادوں کو دامن میں لئے
بن چکی ہے سینۂ محنت میں اک ہلکی سی آہ ۔۔۔ منعموں کی چین پیشانی غریبوں کی نگاہ

موضوعاتِ نظم میں یہاں تک تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ کہ ہمارا شاعر صرف حسن و دلکشی کا جویا نہیں۔ اسکی نظریں حیات کے صرف خوبصورت پہلوؤں پر نہیں پڑیں۔ بلکہ وہ بدصورتی میں بھی حسن دیکھ لیتا ہے۔ وہ صحرا میں بھی نخلستان ڈھونڈ نکالتا ہے۔ وہ صرف شیریں و زلیخا کے حسن کے گیت نہیں گاتا۔ بلکہ مہترانی کو بھی دیکھ کر لاابالیانہ انداز سے الاپنے لگتا ہے ؎

مہترانی ہو کہ رانی گنگنائے گی ضرور
کچھ بھی ہو جائے جوانی گنگنائے گی ضرور (جوش)

ہر وہ چیز جو اسکے جذبات کو گدگداتی ہے اور اس کے احساس کو اکساتی ہے۔ عنوانِ نظم بن سکتی ہے وہ "ٹوٹی ہوئی بوتل" سی حقیر شے سے بھی جو عام طور سے نظر انداز کر دی جاتی ہے متاثر ہو جاتا ہے اور کہتا ہے

ع السلام اے جنتِ بے موج کوثر السلام

مجاز کی "ریل گاڑی"۔ اختر بریلوی کی "ٹھیلا"، وغیرہ نظمیں اس نئے میلان کی حدامکان کی شاہد ہیں۔

۳۴

دورِ حاضر کی شاعری میں بے باکی (جو بعض دفعہ عریانی کی حد تک پہنچ جاتی ہے) نہایت درجہ نمایاں ہے۔ اب جذبات کا گلا نہیں گھونٹا جاتا۔ احساسات پر پردے نہیں ڈالے جاتے۔ عشق و محبت کا اظہار استعاروں میں نہیں کیا جاتا۔ مذکر ضمائر کے استعمال اور طرزِ ادا کے پیچ و خم سے صداقتِ احساس اور خلوص بیان کا خون نہیں کیا جاتا۔ عہدِ حاضر کا شاعر نہ صرف بالواسطہ تخاطب پر عمل پیرا ہے بلکہ زبان و بیان میں اس حد تک تبدیلی کر دی ہے۔ کہ ضمائر کے تانیثی استعمال کے علاوہ محبوبہ کا فرضی یا اصلی نام بھی پیش کرنے سے نہیں جھجکتا ایام جاہلیت میں جبکہ عربوں کی شاعری معراجِ کمال پر تھی عرب شعراء اپنی محبوبہ کو نام بنام مخاطب کرتے تھے۔ اور یہی عین فطرت تھا۔

اختر شیرانی کی "سلمیٰ" اور "ریحانہ"، جاں نثار اختر کی "انجم" ان کی شاعری کی منتہا ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جذبات فطری احساسات شدید اور

طرزِ بیان حد درجہ پُرخلوص ہوگیا۔ علاوہ ازیں ان کی شاعری میں کردار کی استواری بھی پیدا ہوگئی ہے۔ چونکہ ایک ہی محبوب ہستی ہر نظم میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اس لئے جذبات میں باطنی ہم آہنگی۔ اخلاقی بلندی اور روحانی یگانگت کا پرتو نظر آتا ہے۔ حقیقت پرستی کے اس دور میں محبوب کی ہستی فرضی یا تخیلی نہیں رہ سکتی کسی خیالی پیکر میں مستعار جذبات اور مصنوعی الفاظ کی مسیحا نفسی سے جان نہیں ڈالی جا سکتی۔ اب تو محبوبہ ایک جیتی جاگتی انسانی ہستی ہونی چاہیئے۔ جس کے کردار کا خاکہ قارئین کے ذہن پر مرتسم ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ "سلمیٰ" یا "انجم" گوشت پوست کی ہستیاں ہونے کے باعث ہم سے نہایت قریب نظر آتی ہیں۔ اس قسم کی شاعری میں نزاکتِ احساس اور حُسنِ ادا سے جان پڑ جاتی ہے۔

قدیم تہذیب کا تقاضہ تھا۔ کہ جنسیت (SEX) کی دبوا لیں آہنی ہوں۔ لیکن عہدِ حاضر میں صنفِ نازک صنفِ کرخت کے دوش بدوش ہے۔ قدامت پرستی جنسی جذبے کو ایک گناہ گردانتی ہے۔ لیکن آج بیسویں صدی میں یہ جذبہ دوسرے جذبوں کی طرح طبعی خیال کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ رجحان ہماری صحت مندانہ نفس پرستی کا بھی شاہد ہے اور "مذاقِ عجمی" کے ردِ عمل کا نتیجہ ہے۔ فرائیڈ کے نفسیاتی تجزیہ اور (OEDIPUS COMPLEX) کے نظریے نے ہمیں اس قابل بنا دیا ہے۔ کہ ہم اس جذبے کو بخوبی عکس ریز کر سکیں۔ ہماری تمام رومانی شاعری جذبۂ جنسی کے محور پہ گھوم رہی ہے۔

جدید شاعروں کا پہلا مسلک وسعتِ زبان ہے۔ فارسی اور عربی کے مستعمل الفاظ کے علاوہ بھاشا کے میٹھے میٹھے شبد بھی گھُلا ملا کر استعمال کئے جا رہے ہیں۔ جوش کی نظم "یہ کون اُٹھا ہے شرماتا" سے چند بند پیش کئے جاتے ہیں۔

رُخ پہ سُرخی آنکھ میں جادو — بھینی بھینی بر میں خوشبو
بانکی چتون سمٹے ابرو — نیچی نظریں بکھرے گیسو
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا

نیند کی لہریں گنگا جمنی — جلد کے نیچے ہلکی ہلکی
آنچل ڈھلکا مسکی ساری — ہلکی مہندی دھندلی بندی
یہ کون اُٹھا ہے شرماتا

ل۔ احمد صاحب اکبرآبادی نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ "میں سمجھتا ہوں اُردو زبان کی اصلی صورت ان بندوں میں جھلکتی ہے اور اس وقت جو رجحان نظر آ رہا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ پچاس برس گزرنے سے پہلے یہی زبان مقبولِ عام ہوگی۔" اس باب میں ساغر نظامی کی ان تھک کوششیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس کی مشہور نظم "ناگ" کا ایک بند سُنیئے۔

سینہ تانے پھن پھیلائے جھُوم رہے ہو ایسے
جیسے کوئی دکنی کنواری مدھرا پی کر جھومے
اندھیاری درپن ہے تمہارا نور تمہارا ہالا
رات کی دیوی کیا جنگل میں بھول گئی ہے بالا
ٹھہرو اک تصویر بنا لوں اے بانبی کے واسی
آؤ تمہیں تن من میں بسا لوں اے بانبی کے واسی

وہ الفاظ و محاورات جو اب تک حریمِ سخن میں باریاب نہ تھے۔ اس عام پسندی (عوام پسندی نہیں) کے دور میں مختلف طریقوں سے روشناس کئے جا رہے ہیں۔ متروک لیکن جامع الفاظ نئے دور کی ٹکسال میں پسندیدگی کا ٹھپّہ لگا کر رائج کئے جا رہے ہیں۔ غرض یہ ہے کہ جمہوریت کی روح الفاظ و محاورات میں سرایت کر گئی ہے۔ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ جمہور انہیں سمجھ سکے۔ اور ان سے حظ و نشاط حاصل کر سکے۔ آج کل ہر شاعر[1] کا مطمحِ نظر یہی ہے کہ زبان ایسی ہو جسے ہر خاص و عام سمجھ سکے۔ اور طرزِ ادا نہایت صاف روشن سیدھا سادھا اور مؤثر ہو۔ استعاروں کی پیچیدگی، تشبیہوں کی کھینچ تان اور تلمیحات کے ہیر پھیر اب محاسنِ شعری میں داخل نہیں۔ اب تو استعارات اور تشبیہات عام مشاہدے سے اخذ کی جاتی ہیں۔ مثلاً

جھُریوں سے کھُردرا پن چہرۂ بے آب میں
جیسے کھُل جاتی ہیں درزیں سوکھ کر تالاب میں (احسان)

سبزے کے دامن پہ یوں کنڈلی مارے بیٹھے
جیسے کاجل آنکھ سے بہ کر رخساروں کو گھیرے (ساغر)

حوض میں مستانہ بط کے تیرنے سے جس طرح — کائی میں پڑتا چلا جاتا ہے خطِ رہگزار

[1] ہر شاعر کا نہیں، کم از کم جوش کی الفاظ نگاری کا معیار اتنا سخت ہے کہ اُسے عوام تو عوام وہ لوگ سمجھ ہی نہیں سکتے جو شاعری سے بنیادی ذوق نہیں رکھتے۔ (ادارہ)

حافظہ پر یونہی اک بیدار کن گہری خراشس
ڈال دیتی ہے شبِ غم میں پپیہے کی پکار (جوش)

سیدھی سادھی مادی تشبیہوں سے مبہم نفسی کیفیتوں کی عکاسی کی جاتی ہے ؎

آئی جوان کی یاد تو آتی چلی گئی　　ہر نقش ما سوا کو مٹاتی چلی گئی
ویرانہ حیات کے ایک ایک گوشے میں　　جوگن کوئی ستار بجاتی چلی گئی
(جگر)

کیسی دلکش تشبیہوں کے تصوّرات سے محبوب کی رفتار کی تصویر کھینچی گئی ہے

کوئی خوابوں سے بنائی ہوئی شے ہے گویا　　جامِ سرشار سے چھلکی ہوئی مے ہے گویا
بھری برسات کی راتوں میں جیسے گاتے ہیں　　تیری رفتار اُسی گیت کی لے ہے گویا
(اختر انصاری)

جدید شاعر بحور و اوزان کے استعمال میں بھی بڑی حد تک آزاد و خود پسند واقع ہوا ہے۔ حفیظ جالندھری کی نظم "ابھی تو میں جوان ہوں" کا ایک اقتباس پیش ہے۔ یہ نظم کسی مقررہ صنفِ سخن کے تحت میں نہیں آتی ؎

عبادتوں کا ذکر ہے　　نجات کی بھی فکر ہے
جنون ہے ثواب کا　　خیال ہے عذاب کا
مگر سنو تو شیخ جی　　عجیب شے ہیں آپ بھی
بھلا شباب و عاشقی　　الگ ہوئے بھی ہیں کبھی
حسین جلوہ ریز ہوں　　ادائیں فتنہ خیز ہوں
ہوائیں عطر بیز ہوں　　تو شوق کیوں نہ تیز ہوں
نگار ہائے فتنہ گر　　کوئی ادھر کوئی اُدھر
اُبھارتے ہوں عیش پر　　تو کیا کرے کوئی بشر
چلو جی قصہ مختصر　　تمہارا نقطۂ نظر
درست ہو تو ہو مگر
ابھی تو میں جوان ہوں

بحور و اوزان کے انتخاب میں زیادہ تر ذوقِ ترنّم کو رہبر بنایا جاتا ہے۔ قوافی و ردیف کی بے جا پابندیوں کے خلاف یہاں تک علمِ بغاوت بلند کیا گیا ہے۔ کہ ردیف قافیہ اور بحر سے آزاد نظموں کا رواج چلا ہے۔ "میراجی" خالد، ن۔م راشد، فیض احمد فیض اسی رنگ کو رائج کرنے میں پیش پیش ہیں۔ یہ صرف جذبات کی ادائگی اور نفسی لہروں کی (PSYCHIC WAVES.) عکاسی پر زور دیتے ہیں۔ ن۔م راشد کی ایک نظم "خودکشی" کا ایک بند سنیئے ؎

کر چکا ہوں آج عزمِ آخریں
میرا عزمِ آخریں یہ ہے کہ میں
کود جاؤں ساتویں منزل سے آج
آج میں نے پالیا ہے زندگی کو بے نقاب
آتا جاتا ہوں بڑی مدّت سے میں
ایک عشوہ ساز و ہرزہ کار محبوبہ کے پاس
اس کے تختِ خواب کے نیچے مگر
آج میں نے دیکھ پایا ہے لہو
تازہ و درخشاں لہو

گیت اردو سے بھی مقبول ہو رہے ہیں۔ گیت ہندوستان کی روحِ شعر کی پہلی انگڑائی ہے۔ یہ عوام الناس کی زندگی کا جزو لاینفک ہے ہر ملک میں (FOLK SONGS.) مقبول رہے ہیں۔ اب کہیں جاکر ہمارے شاعروں نے بھی اپنی توجہ اس طرف مبذول کی ہے۔ ساغر اور حفیظ کے گیت خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ حفیظ الفاظ کی موسیقی کا زیادہ خیال کرتا ہے اور ساغر الفاظ کی موسیقی کے ساتھ روح کی موسیقی بھی پیدا کر دیتا ہے۔ حفیظ کے گیتوں میں کبیر کی سی پند و نصیحت پائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس ساغر پریم کے گیت الاپتا ہے۔ ان میں پند و نصیحت کے مٹیل پن کے برخلاف کنواری کنیّا کی سی لچک اور جھجک نظر آتی ہے۔

بیسویں صدی کا انسان اپنے آباؤ اجداد کی نسبت زیادہ مصروف اور کثیر المشاغل ہے۔ اسکی زندگی ایک بے تحاشہ دوڑ کے مشابہ ہے جس میں "آگے بڑھینگے دم لیکر" کی کوئی گنجائش نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت کی رفتار بڑھتی جا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ میں بہت سی ایسی تحریکیں آئے دن وجود میں آتی رہتی ہیں جن کا منشا وقت کی بڑھتی ہوئی رفتار اور زندگی کی غیر فطری سرعت کا انسداد کرنا ہے اور بنی نوع انسان کے لئے آرام اور فرصت کا وقت نکالنا ہے۔ فرصت کے لمحات کے اختصار کا ادب پر یہ اثر پڑا کہ آج مختصر افسانے، ایک ایکٹ کی تمثیلیں اور چھوٹی چھوٹی نظمیں رائج ہو رہی ہیں۔ اُردو اس سے مستثنیٰ نہیں۔ "سحر البیان" کی سی شیطان کی آنت

آنت مثنویاں ناپید ہیں۔ یہ بھی کسی قدر پُرانے زمانے کا قصہ ہے لیکن جدید
اور قدیم جدید ادب میں بھی زمین اور آسمان کا فرق نظر آرہا ہے۔ آج "شمع اور شاعر"
کی سی طویل نظمیں بھی مفقود ہیں۔ نظموں کے اختصار کی حد یہ ہے۔ کہ اب قطعہ
اور رباعیات قبولیت عامہ حاصل کر رہی ہیں۔ نہ صرف اصناف سخن کی طوالت
اختصار میں تبدیل ہو رہی ہے بلکہ نفس مضمون بھی اس سے متاثر ہو رہا ہے
ہمارے زمانہ کا انسان ایک وقت میں ایک ہی کام کر سکتا ہے۔ ایک ہی بات
سوچ سکتا ہے۔ اور ایک ہی بات قبول کر سکتا ہے۔ اس لئے تمام اصناف
سخن میں وحدتِ تاثر اساسی حیثیت رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ غزل بھی جو گوناگوں
احساسات اور بوقلموں جذبات بلکہ بعض دفعہ متضاد جذبات کا آئینہ ہوتی
تھی جس کا ایک شعر وصل کی لذت دوسرا شعر ہجر کی اذیت تیسرا محبوب کے
تغافل چوتھے اس کے التفاتِ بے پایاں کا ترجمان ہوتا تھا۔ آج "وحدتِ
تاثر" پر مبنی ہے۔ مسلسل غزلوں کو چھوڑ کر عام غزلوں کی تہ میں بھی ایک ہی تاثر
ایک ہی جذبہ ایک ہی نفسی رَو کارفرما نظر آتی ہے مثلاً جگر کی ایک غزل ہے ؎

بیتاب ہے بےخواب ہے معلوم نہیں کیوں؟ دل ماہیِ بے آب ہے معلوم نہیں کیوں؟
بے کیف مئے ناب ہے معلوم نہیں کیوں؟ پھیکی شبِ ماہتاب ہے معلوم نہیں کیوں؟
بے نام سی ایک یاد ہے کیا جانئے کس کی؟ بے وجہ تب و تاب ہے معلوم نہیں کیوں؟
دل آج بھی سینے میں دھڑکتا تو ہے لیکن کشتی سی تہِ آب ہے معلوم نہیں کیوں؟
دیکھا تھا کبھی خواب سا معلوم نہیں کیا ابتک اثرِ خواب ہے معلوم نہیں کیوں؟
معلوم یہ ہوتا ہے کہ ہر تازہ تغیر میرے لئے بیتاب ہے معلوم نہیں کیوں؟

قطعات مبہم جذبات اور دُھندلے احسات کے اچھوتے مرقع ہیں اکثر
قطعات ایک نظم کی سی جامعیت رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہمارے احساسات
اس درجہ نازک اور ہمارے جذبات اس حد تک ذکی الحس ہو گئے ہیں کہ
تفصیل کی بجائے اختصار اور صریح بیان کی بجائے کنایوں سے کام لیا جا سکتا
ہے اسی لئے عموماً قطعات میں اشاروں اور کنایوں سے وہ بات کہہ دی جاتی
ہے کہ شاعر کے حُسن بیان اور حُسن احساس سے کیف و سرور کی ایک موج
دل و دماغ کو چھو کر نکل جاتی ہے ؎

جو کوئی پوچھتا ہے سرخ کیوں ہیں آج آنکھیں تو آنکھیں مل کے میں کہتا ہوں آج سو نہ سکا
ہزار چاہوں مگر یہ نہ کہہ سکوں گا کبھی کہ رات رونے کی خواہش تھی اور رو نہ سکا

(اختر انصاری)

انسانی نفسیات اور جذبات صدیوں سے شعر کا جامہ پہنتے رہے ہیں لیکن آج
بھی انہی احساسات اور جذبات پر ایسے مختلف زاویوں سے روشنی ڈالتے
ہیں کہ ایک نیا لطف، ایک نامحسوس حظ حاصل ہوتا ہے۔

دورِ حاضر کا ہر شاعر اپنا کلام ترنم سے پڑھتا ہے۔ ریڈیو کے مشاعروں
نے قارئین کے ساتھ سامعین کا حلقہ وسیع سے وسیع تر کر دیا ہے۔ اس کا
کلام پر یہ اثر پڑا۔ کہ ہر شاعر ایسے الفاظ اور تراکیب انتخاب کرتا ہے جو مل
جُل کر ایک نوع کی روانی اور ایک قسم کی موسیقی پیدا کر دیتی ہیں۔ وہ مترنم الفاظ،
موسوقیت نواز تراکیب، متوازن ٹکڑے استعمال کر کے حُسن تناسب میں ایک ایسا
آہنگ پیدا کر دیتا ہے کہ غزل یا نظم سے بہتے ہوئے دریا کی سی روانی اور
ستاروں کی سی راگنی سے مملو نظر آتی ہے۔ گویا شاعری "غنائیت" سے قریب تر
ہو گئی ہے۔ بھاشا کے الفاظ کی کثرت استعمال اور گیتوں کی مقبولیت سے
خیال ہوتا ہے کہ وہ زمانہ دور نہیں جب ہر نظم بجائے خود ایک نغمہ ہو گی۔
نغمہ بھی شعر کی طرح اظہارِ جذبات کا ایک ذریعہ ہے۔ جذبات کے تنوع کے ساتھ
نغمات بھی متنوع ہوتے ہیں۔ "نوحۂ غم" "نغمۂ شادی" سے مختلف ہوتا ہے
رجز اور ساون کے گیتوں میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ میدانِ کارزار
کی موسیقی اور شبستان کی موسیقی میں بیّن امتیاز پایا جاتا ہے۔ شاعری اور
موسیقی توام فنون لطیفہ ہیں۔ اکثر شاعری موسیقی اور موسیقی شاعری بن
جاتی ہے۔ جدید شاعری بھی موسیقی سے ہم آغوش ہوتی جا رہی ہے۔ آج
شاعر کے خلوص بیان کی حدود فطرت کی حدود سے ملتی جا رہی ہیں۔ اسی
لئے اسکے جذبات نغمات کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں "یہ کون اُٹھا
ہے شرماتا" کی موسیقی اور "بغاوت" کا رجز نفس مضمون سے ہم آہنگ ہے۔

ہماری جدید شاعری کا ایک رجحان فطرت پرستی کی طرف بھی ہے۔ گو ابھی
پرستار فطرت ورڈز ورتھ کی سی نظمیں مفقود ہیں۔ اُردو کی اس تہی دامانی کا
ماتم کرتے ہوئے صاحب تاریخ ادب اُردو اس طرح رقمطراز ہیں "دیہاتی
اور قدرتی مناظر کے لحاظ سے اُردو شاعری کا دائرہ محدود ہے۔ قدرتی
مناظر جو شعرائے مغرب کے دلوں میں عجب عجب اُمنگیں پیدا کرتے ہیں
ہمارے اُردو شاعروں پر وہ اثر نہیں کرتے۔ مولانا الیاس برنی بھی "مناظرِ
قدرت" کی تمہید میں لکھتے ہیں۔ قدرت کو لیجئے اسکے بیشمار عجائبات آنکھوں

کے سامنے ہیں۔ لیکن ہمارے شعراء نے کہیں اب جا کر نقاشی شروع کی ہے اور ابھی وہ زمانہ دور ہے کہ نیچر کی تصاویر مُنہ سے بولنے لگیں"۔ فطرت کی تصاویر اکثر نظموں کے پسِ منظر کے طور پر تو پیش کر دی جاتی ہیں۔ لیکن محض فطرت کی پرستاری بالذّات مقصود نہیں۔ جوشؔ نے اکثر نظمیں فطرت کے معصوم مناظر سے متاثر ہو کر لکھی ہیں۔ لیکن جوشؔ میں ورڈز ورتھ کی سی والہانہ شیفتگی اور روحانیّت کا پر تو نظر نہیں آتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوشؔ فطرت سے مانوس نہیں۔ وہ صرف فطرت کا تماشائی ہے تمنائی نہیں وہ فطرت کے مناظر میں کھو نہیں جاتا۔ بلکہ بیدار احساس اور بینا آنکھ سے اسکے حُسن کا جائزہ لیتا ہے ؎

خامشی دشت پہ جس وقت کہ چھا جاتی ہے

عمر بھر جو نہ سُنی ہو وہ صدا آتی ہے

دشنہ رکھ دیتا ہے گھبرا کے رگِ جاں پہ کوئی

جب کلی خاک پہ دم توڑ کے گر جاتی ہے

مسکراتی ہے جزرہ رہ کے گھٹا میں بجلی

آنکھ سی کوہ و بیاباں کی جھپک جاتی ہے

جھاڑیوں کو جو ہلاتے ہیں ہوا کے جھونکے

دلِ شبنم کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے

مجھ سے کرتے ہیں گھنے باغ کے سائے باتیں

ایسی باتیں کہ مری جان پہ بن جاتی ہے

جب ہری دوب کے مُرجھاتے ہیں نازک ریشے

شیشۂ قلب میں ایک ٹھیس سی لگ جاتی ہے

ان مناظر کو میں بے جان سمجھ لوں کیونکر

جوشؔ کچھ عقل میں یہ بات نہیں آتی ہے

(از "ذی حیات مناظر" بہ تصرف)

قلبِ صحرا میں جھٹپٹے کے وقت — دل میں غلطاں ہے ایک طرفہ امنگ

مجھ سے کہتا ہے کیا خدا جانے — دھان کے کھیت پر شفق کا رنگ

اس کا تو عقیدہ ہے ؎

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کیلئے — اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

اس باب میں جوشؔ بجنوری مرحوم کی اصطلاح کے مطابق "رب النوع".

کہلانے کا مستحق ہے اسکی اکثر نظمیں مثلاً "شام کا رومان" "بہار کی ایک دوپہر" "روحِ شام" "جذباتِ فطرت" وغیرہ ہماری شہانی شاعری کی زینت بنی رہینگی۔ عام روش سے ہٹ کر ایک نئی ڈگر نکالنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ آئندہ آنے والے شاعر اس راہ پر گامزن ہونگے۔ جو ممکن ہے ہماری شاعری کی ایک شاہراہ بن جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے شاعروں کو دُنیا کے تلخ حقائق کی چلچلاتی دھوپ سے فطرت کے سکون پرور سائے میں دم لینے کی فرصت ہی نہیں اور یہی ان کیلئے اچھا بھی ہے۔ زمانہ آئیگا کہ وہ فطرت کے آغوش میں سکون کے متلاشی ہونگے۔

آج دُنیا ایک عجب بدنظمی، انتشار، ابتری اور ہلچل کے بھنور میں پھنسی ہوئی ہے۔ سماجی افراتفری اور دماغی افلاس کے باعث مذہب جو سکون اور شانتی کا پیغام تھا۔ پس پُشت ڈال دیا گیا۔ آج تنقید کا دور دورہ ہے۔ تلقین کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اعتقاد کی جڑیں تشکیک نے ہلا کر رکھ دی ہیں۔ سائنس کی دن دونی اور رات چوگنی ترقّی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ غرض اس دورِ عقلیت میں تصوّف اور روحانیّت کی دال نہیں گل سکتی۔ مذہب کا سکّہ نہیں چل سکتا۔ حتّٰی کہ وجودِ خداوندی بھی معرضِ شک میں پڑ گیا ہے۔ ہندوستان میں دہریت ایک اور وجہ سے بھی فروغ پا رہی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب مظلوم و مجبور انسانوں پر اس حد تک ظلم و ستم روا رکھے جاتے ہیں۔ کہ وہ دبے سانپ کی طرح کاٹنے کو دوڑتے ہیں۔ تو ایسی حالت میں وہ ہر ظالم و جابر ہستی سے باغی ہو جاتے ہیں خواہ وہ انسانی ہو یا مافوق الانسانی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے اکثر شاعر اشتراکیّت کے زیرِ اثر تصوّف، روحانیّت اور مذہب سے منحرف ہونے کے بعد خدا سے بھی باغی ہو گئے ہیں۔ وہ کسی ایسے "شخصی" خدا کے قائل نہیں جو قہار و جبار ہو ؎

اللہ کو قہار بتانے والو — اللہ تو رحمت کے سوا کچھ بھی نہیں

وہ سماج کے بیجا بندھنوں، تقسیمِ دولت کی بدعنوانیوں، سیاسی عیاریوں اور شیطانی بدکاریوں کو آسمانی خدا نہیں، ارضی انسانی جابروں سے منسوب کرتے ہیں اور بعض دفعہ اس روح فرسا کشمکش سے مجبور ہو کر کہہ اُٹھتا ہے ؎

تیرا اک بندہ تجھ کو روتا ہے — اے خدا مر گیا کہ سوتا ہے (مجاذبؔ قریشی)

ایشیا جون جولائی ۱۹۴۶ء

وہ ایک ایسے خدا کو تو ضرور مانتے ہیں ؎

"جس کے قبضے میں زماں ہے جس کے قدموں پہ زمیں"

آج تک پہنچی نہیں جس اوج تک چشمِ خیال

ایک نامعلوم قوت ایک نا دیدہ جلال

"داغِ شخصیت" سے ہے ناآشنا جس کی جبیں

نوعِ انساں کے تعاون کی جسے حاجت نہیں

جس کا ہر تارہ ہے مصحف جس کا ہر ذرّہ کتاب

جس کے دفتر کی ہے زرّیں مہر فرضِ آفتاب

وہ خدا وہ طاقتِ مخفی وہ دارائے حیات

جس کی ایک ادنیٰ سی جنبش کا لقب ہے کائنات

علاوہ ازیں دنیا کو رنگ و نسل کے امتیازات، صنعت و تجارت کی مقابلہ بازی، کمزور اقوام کی پائمالی اور آئے دن کی خونریزیوں سے نجات دلانے کی آس صرف بین الاقوامیت سے بندھتی ہے۔ ہمارا شاعر بھی آبائی مذہب سے کنارہ کش ہو کر صرف بین الاقوامیت کو اپنا مذہب اپنا دین، اپنا ایمان قرار دیتا ہے ؎

۳۸

اُٹھ کھڑے ہو آؤ تکمیل عبادت کے لئے	اک نیا نقشہ بنائیں آدمیت کیلئے
آؤ محفل میں جلائیں بھی بصد شان فراغ	نوعِ انسانی کی مجموعی اخوت کا چراغ
اور کچھ حاجت نہیں ہے دوستی کیواسطے	آدمی ہوتا ہے کافی آدمی کیواسطے
آؤ وہ صورت نکالیں جس کے اندر جان ہو	آدمیت دین ہو انسانیت ایمان ہو

(جوشؔ)

ہمارے ملک کی موجودہ تباہ ناک حالت سماجی افراتفری، دماغی افلاس اور روحانی جمود کا تقاضہ تھا کہ ہمارے ادب میں قنوطیت کی روح سرایت کر جائے لیکن اسکے برخلاف ہماری شاعری رجائیت کے جذبے سے مملو نظر آتی ہے۔ یہ ایک نیک شگون ہے۔ لیکن یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ ہماری قنوطیت حد کو پہنچ چکی تھی۔ چونکہ قنوطیت کی تیرہ و تار شب ہی رجائیت کی صبح تابناک کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ مزید برآں ہماری شاعری جو محض حسن و عشق اور شراب و کباب کا مجموعہ کہی جاتی ہے۔ ملک و قوم میں ایک ذہنی انقلاب پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو رہی ہے اور پھر سیاسی و سماجی انقلاب کی ابتدا ذہنی انقلاب سے ہوتی ہے۔

اگر مندرجہ بالا تمام رجحانات یکجا دیکھنے ہوں تو ساغرؔ کی نظم "ناگ" پڑھیے۔ شاعر سماج سے باغی ہے۔ سرمایہ داری سے بیزار ہے۔ موجودہ نظام سے اُکتا گیا ہے۔ اسکی نظر "ناگ" پر پڑتی ہے "ناگ" جس سے ہر شخص ڈر کر بھاگتا ہے جس کے پاس کوئی نہیں پھٹکتا۔ باغی شاعر سے بھی کوئی محبت و ہمدردی نہیں کرتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دیوانہ ہے جس سے سب ڈر کر بھاگتے ہیں۔ اسے دیکھ کر سرمایہ دار تیوری پر بل ڈال لیتے ہیں "پنڈت، ملّا، لالے" نفرت سے منہ پھیر لیتے ہیں۔ دونو دنیا کے ظلم و ستم کے زخم خوردہ ہیں۔ دونو نفرت و کراہیت کا تختۂ مشق ہیں۔ باغی شاعر فوراً "ناگ" کا گرویدہ ہو جاتا ہے اور مسرت کا ایک بے اختیار نعرہ لگاتا ہے جیسے کسی اجنبی کو اپنا ہموطن نظر آ جاتا ہے اور کہہ اُٹھتا ہے۔ ع

آؤ تمہیں تن من میں بسا لوں اے بانبی کے واسی

وہ ناگ کے حسن کے گیت الاپنے لگتا ہے۔

باغی شاعر اور ناگ میں ایک اور بھی مماثلت ہے۔ کہ شاعر تخریب کا حامی ہے۔ تخریب کی تصویر ناگ کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ وہ بھی فطرت کی تخریبی طاقتوں میں سے ایک طاقت ہے۔ شاعر ناگ بن کر سرمایہ داروں اور اجارہ داروں کو ڈس لینا چاہتا ہے۔ وہ ناگ کا مقابلہ اور دوسرے ہزاروں انسانی ناگوں سے کرتا ہے اور آخر یہ نتیجہ نکالتا ہے ؎

بس ہے تمہارا بوند برابر ان کا زہر سمندر

ڈنک تمہارا ویرانوں تک ان کا ڈسا گھر گھر

تیرا کاٹا اک دن زندہ ان کا کاٹا پل بھر

سحر تمہارا سر پر بولے ان کا جادو من پر

دل سے ان کا زہر ہٹا لوں لے بانبی کے باسی

آؤ تمہیں تن من میں بسا لوں اے بانبی کے باسی

یہ نظم نہ صرف انقلاب کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے بلکہ اس میں ہماری جدید شاعری کی دوسری خصوصیات بھی نظر آتی ہیں۔ اس کی زبان عام فہم، الفاظ میٹھے اور سُریلے ہیں۔ یہ اُردو ہندی ملاپ کا بہترین نمونہ ہے۔ اس میں بہتے ہوئے پانی کی سی روانی اور موسیقی پائی جاتی ہے تشبیہات عام مشاہدے سے ماخوذ ہیں اور ایک ندرت اور جدت لئے ہوئے ؎

سبزے کے دامن پر یوں کنڈلی مارے بیٹھے
جیسے کاجل آنکھ سے بہ کر رخساروں کو گھیرے
سورج کی کرنوں سے ایسے چمک رہا ہے مکھڑا
جھل مل جھل مل جیسے جھومر کرے کسی دلہن کا

سینہ تانے پھن پھیلائے جھوم رہے ہو ایسے
جیسے کوئی دکھی کنواری مدھرا پی کر جھومے
اندھیاری دھرتی ہے تمہارا نور تمہارا اجالا
رات کی دیوی کیا جنگل میں بھول گئی ہے بالا

عہد حاضر کا ہر شاعر اپنی بقا کا راز انفرادیت میں پاتا ہے۔ اور اسی لئے اپنی انفرادیت قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ساغر کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ اپنے گیتوں میں ہندو علم الاصنام (MYTHOLOCY.) کا پیوند لگا کر ان کا دامن ہند کے عہد عتیق کی تہذیب و تمدن سے باندھ دیتا ہے۔ یونانی علم الاصنام ابتک انگریزی شاعری کی تشبیہات، استعارات اور تلمیحات کا مخزن بنا ہوا ہے۔ ساغر ناگ کو موت کی گردن کی ہیکل، شنکر کا جوشن، اور کالی کی جھانجن کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ اس نظم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ نظم گیت کی شکل میں ہے۔ گیت ہماری حیات کا ایک جزو ہے۔ اس لئے عوام الناس کے دلوں کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ گیت نصیحت (INCTRUCTION) کی بجائے اشارت (INSINUATION.) پر مبنی ہے جو کسی ملک کے اعلیٰ ترین ادب کا طغرائے امتیاز ہے۔

ساغر کی چند جدید نظمیں اردو شاعری میں ایک نئے رنگ کا اضافہ کر رہی ہیں۔ "اتنی فرصت کہاں" ماحول اور زمانہ کی تمام بے چینیوں اور انکے ردعمل کا آئینہ ہے۔ شاعر کی حساس روح، بیرونی اثرات کو ایک اندرونی کیفیت سے ترتیب دے کر عجب چیز بنا دیتی ہے۔ دور حاضر کی طلسم شکنی کہ شاعر یا عاشق یا محبوب، محبت کو ٹھکرا رہا ہے۔ پچھلی صدی کا شاعر ایسے عاشق کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ترقی اور بلندی کا نصب العین جس کے حصول کیلئے نئے زمانہ انسان کو سچے معنی میں مشین بن جانا پڑتا ہے علو مقصد اور اسکے مقابلے میں وقت کی رفتار، یہ سب باتیں الفاظ کے ایسے تانے بانے میں بنی ہوئی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے، ساغر کی نظموں کی

جھلملیوں میں سے حیات کے تاریک پہلوؤں کی جھلک نظر آتی ہے بعض دفعہ میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ مادر گیتی یا روح عصر اپنے اندرونی درد و کرب کی آہوں کو اسکے شعروں سے متکلم بنا رہی ہے۔

اگرچہ جنگ کے شعلے ہمارے ملک سے دور ہیں لیکن ان کی آنچ ہمارا شاعر اپنے قلب پر محسوس کرتا ہے اور اپنے ہم وطنوں کے احساس وطنیت، جذبۂ مدافعت اور ولولۂ آزادی کو بیدار کرنے کیلئے ایک جنگی ترانہ چھیڑتا ہے۔

پھر امن کی رنگیں وادی سے ہنگامۂ گیر و دار اٹھا
دنیائے سکوں کے پہلو میں اک فتنۂ حشر آثار اٹھا
ہستی کی بہاریں مطلع پر اک ابر شرارہ بار اٹھا
بیکار ہیں چنگ و تار اٹھا اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

دشمن ہے قریب اور خطرے میں ہے ماہ لقائے آزادی
دل میرا نثار آزادی جاں میری فدائے آزادی
اٹھ جلد کہ ظالم چھین نہ لیں ملت کا لوائے آزادی
وہ غلغلۂ یلغار اٹھا اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

ناموس وطن کو غیروں کے پنجوں سے بچانے جاتے ہیں
مدت سے ہیں پیاسی تلواریں پیاس انکی بجھانے جاتے ہیں
دشمن کی تڑپتی لاشوں کا کھیل ان کو دکھانے جاتے ہیں
لا برق فنا آثار اٹھا اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

پھر چشم براہ جرأت ہے لیلائے شہادت میداں میں
شاداب ہوا کرتی ہے صدا ہر قوم کی عظمت میداں میں
تلواروں کے خونیں آنچل سے کھل جاتی ہے جنت میداں میں
گلہائے طرب کا بار اٹھا اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا

(اختر شیرانی)

موجودہ جنگ نے دنیا کو جو کچھ بھی نقصان پہنچایا ہے لیکن اردو ادب میں ایک لافانی رزمیہ نظم کا اضافہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ آجتک ان ممالک میں بھی جہاں لوگ اپنی آزادی برقرار رکھنے کیلئے جانوں کی بازی لگا رہے ہیں ایسا جوشیلا جنگی ترانہ نہیں سنا گیا۔ وہ حضرات آئیں جو اردو شاعری کو "رجعت پرست" کہکر ہماری ترقی کو ترقی معکوس بتلا رہے ہیں اور دیکھیں کہ ہماری شاعری کس طرح رفتار

زمانہ کانپور جولائی ۴۲ء

سراج الدین آذر

فارسی اور ہندوستانی تہذیب

کسی ملک کی تہذیب ۔ اس کا کلچر ۔ اسکی زبان ۔ اس کا ادب ایسی چیزیں ہیں جو صدیوں میں تشکیل پاتی ہیں ۔ زمانہ کا بہاؤ ۔ حکومت کے انقلاب ۔ باشندوں کی مزاجی تبدیلیاں اور بیرونی ممالک اور اقوام سے اثر و تاثر ۔ ادب ۔ زبان وغیرہ کو نئے سانچوں میں ڈھالتے رہتے ہیں زبان بالخصوص اتنے اثرات قبول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے کہ اسکی عہد بعہد ترقیوں کا جائزہ لینا دلچسپیوں سے پُر ہے ۔

ترکوں کا ہندوستان کو فتح کرنا ایک اہم واقعہ ہے جس کے بے پناہ اثرات سے ہندوستانی تہذیب اور کلچر پر ایک کاری ضرب لگی ۔ اور وہ چوٹ کھا کر جوابی طور پر فاتحین کے خیالات و تصورات پر حملہ آور ہوا گرد و پیش کے حالات جس شدت کے ساتھ کسی قوم کے دل و دماغ ۔ انکے خیالات ۔ عادات و طوار حرکات و سکنات پر اثر انداز ہوتے ہیں ۔ اسکی مثال اس سے بہتر شاید نہ مل سکے ۔ ترک اور مغل جب ہندوستان میں آئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے اور ہندوستانیوں کے کلچر میں کوئی مشترکہ اوصاف ہی نہیں ہیں ۔ مغل اور ہندوستانی ۔ بول چال ۔ رنگ ڈھنگ آداب و اخلاق بہت سے پہلوؤں سے مختلف بلکہ متضاد دکھتے ۔ اس اجنبیت کے باوجود ان دو تہذیبوں کا ایک دوسرے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکنا قوموں کے باہمی مدنی انحصار کی ایک ایسی دلیل ہے جسے آسانی سے جھٹلایا نہیں جا سکتا ۔

مغل اور ہندوستانی کلچر میں پہلے تصادم ہوا ۔ پھر گریزاں سی آشنائی ۔ پھر کچھ رسمی ربط ۔ آخری شکل جو اس باہمی تعلق نے اختیار کی وہ حاکم و محکوم کا رشتہ تھا ۔ ترک اور مغل ہندوستان میں فاتح بن کر آئے تھے اور ان کی زبان کچھ مدت کے بعد فارسی ہو گئی تھی ۔ عربی کا مقولہ ہے "النّاس علیٰ دین ملوکھم" یعنی رعایا بادشاہ کے دین کے تابع ہوتی ہے ۔ زبان بھی علم و فن ۔ صنعت و صناعی اور اخلاق و اطوار کی طرح سلطنت کے اثر کی مغلوب ہوتی ہے ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سلطنت کا مذاق ہر چیز میں سرائت کر جاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ فارسی بہت جلد ہر دلعزیز ہو گئی اور ہندوستانیوں نے بلا تفریق مذہب و ملت اس میں کمال حاصل کرنے کی کوشش کی ۔ زبان میں بدلتے ہوئے حالات اور بگڑتے یا بنتے ہوئے کلچر کا عکس آنا لازمی تھا ۔

فارسی اور ہندی الفاظ کا رد و بدل اور لین دین غزنوی دور سے ہی شروع ہو گیا تھا ۔ چنانچہ اس عہد کے شعراء اور مورخین ۔ فردوسی ۔ عنصری ۔ فرخی ۔ اسدی ۔ سنائی اور بیہقی کے ہاں ذیل کے ہندی الفاظ ملتے ہیں :۔

بت ۔ دشمن ۔ شارہ کت بمعنی تخت ۔ کوتوال ۔ نو بہار (عبادتگاہ) بیلک ۔ لگھن ۔ شل ۔ کتارہ ۔ چندن اور پانی ۔

ابو الفرج رونی ۔ جو شاہ ابراہیم اور اسکے بیٹے مسعود ثالث کے عہد کا شاعر ہے ۔ اسکے کلام میں دند ۔ جوہر اور جت ہندی الفاظ پائے جاتے ہیں ۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ؎

بشکل پیل یک دندش نظر کن

بقول صاحب فرہنگ رشیدی دند ہندی لفظ ہے ۔ فرہنگ آنندراج میں لکھا ہے ۔

"گویا ایں مفرس دنت باشد کہ لغت ہندی است"

لیکن میرے فاضل دوست پروفیسر حافظ محمود شیرانی کا خیال ہے کہ چونکہ ابو الفرج رونی لاہوری ہے ۔ دند اس نے پنجابی زبان سے لیا ہے پیل یک دند سے شاعر کا مقصد ایک دنتا ہاتھی ہے ۔ جت بھی اصل میں پنجابی لفظ جٹ ہے جسے اُردو میں جاٹ کہتے ہیں ۔

جوہر سے مقصد راجپوتوں کی معروف رسم ہے ۔ یعنی غالب دشمنوں سے عہدہ برآنہ ہونے کی صورت میں وہ اپنے مال و اسباب کو جلا کر اور اہل و عیال کو قتل کر کے آ ڈٹتے تھے اور جبتک ایک ایک کر کے ہلاک نہ ہو جاتے منہ نہ موڑتے ۔

ایشیا جون جولائی ۱۹۴۲ء

مسعود سعد سلیمان نے کت (بمعنی تخت) - مارامار (آپس کی مار پیٹ) اور برشکال یعنی برش کال بمعنی (برسات کا موسم) ہندی الفاظ استعمال کئے ہیں -

حکیم سنائی غزنوی المتوفی ۵۴۵ھ کے کلام میں ہندی لفظ پائی اور کوتوال (کوٹ والا بمعنی مالک حصار) پائے جاتے ہیں -

اسی طرح تاج الدین ریزہ کے ہاں سیر اور من (۴۰ سیر کے معنوں میں) ملتے ہیں -

طبقات ناصری از منہاج سراج جو ۶۵۸ھ کی تصنیف ہے اس میں یہ ہندی الفاظ پائے جاتے ہیں -

سیل (بھیڑ) - لک (لاکھ) - نوبہار (یعنی نووہار بمعنی عبادتگاہ) -

دقیقی شاعر نے بھی نوبہار لہراسپ نامہ میں استعمال کیا ہے [۹]

بلخ گزیں شد بداں نو بہار — کہ یزداں پرستاں آں روزگار
مرآں خانہ را داشتندے چناں — کہ مرمکہ را تازیاں ایں زماں

امیر خسرو کے یہاں کثرت سے ہندی الفاظ اور محاورے پائے پائے جاتے ہیں - طوالت کے خوف سے میں ان میں سے صرف چند ایک کا ذکر کرونگا :-

ساگر (ساگر بمعنی حوض و تالاب) - راوت (راجپوت) - پایک (پیادہ) - (پگڑی) - بیڑہ - تنبول - دھانک (تیرانداز) - بسیٹھ (ایلچی و سفیر) - بیل - سیوتی - کیوڑہ - مولسری -

تاریخ فیروزشاہی میں جو ۷۵۸ھ کی تصنیف ہے کم از کم ۸۰ ہندی لفظ آئے ہیں - ان میں سے بھی چند ایک سن لیجئے - تگبنی (ایک قسم کی شراب) منڈہ (منڈی) - سوندھار (بمعنی اُدھار) - ادی (بمعنی باربردار) - مار مار (بمعنی سعی بسیم) - سکھ آسن (پالکی) - ڈانگ (کٹھ) - منڈل (جلسہ و جماعت)

سیر الاولیا میں کئی لفظ ہندی کے آئے ہیں - مثلاً لینگھن می روزہ - بھاگسی بمعنی قید خانہ -

مجھے اندیشہ ہے کہ اس فہرست الفاظ سے جنکی نیرنگیاں ایک ہر لسانیات کے لئے "سامان صد ہزار نمکداں لئے ہوئے ہیں"

آپ اُکتا گئے ہونگے - اس لئے میں مفرح القلوب میں سے صرف چند ہندی کے لفظ پیش کر کے اس بحث کو ختم کرتا ہوں -

جوگی - کھبر (پیالہ رکابی) - مراتبہ (مرتبہ) - لنگوتی - چھتر -

اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ نویں صدی ہجری تک فارسی زبان ہندوستان میں ہمہ گیری صورت اختیار کر چکی تھی - فارسی جاننے والوں کی تعداد اس وقت تک بہت کم تھی لیکن ماحول کے گوناگوں اثرات سے فارسی زبان متاثر ہو رہی تھی - اور مجھے یہی دکھانا مقصود تھا -

جس طرح ہندی الفاظ فارسی میں داخل ہو گئے - فارسی عربی الفاظ ہندی کتابوں میں دخل پا گئے - نرپتی نلہ ایک ان پڑھ شاعر تھا ۱۱۵۵ء میں اس نے ایک کتاب "بیل دیو راسو" نظم میں لکھی - اس میں اور اس وقت کی دیگر ہندی کتابوں میں متعدد لفظ عربی فارسی کے ملتے ہیں نمونے کیلئے دیکھئے -

مہل (محل) - ہجرت (حضرت) کھدا (خدا) - سرتان (سلطان) - ساہب (صاحب) - پھرمان (فرمان) - کھلک (خلق) - کلا (کلاہ) - کبائے (قبا) - پاگا (پائے گاہ) باجا باجا (بعض بعض)

دلچسپ بات اس میں یہ ہے کہ فارسی الفاظ کو ہندی نے انکی اصلی حالت میں قبول نہیں کیا - بلکہ اپنے مزاج اور اپنی ضرورت کے مطابق انہیں ڈھال لیا ہے - خلق کی خ کو ادا کرنے اور ق کا ڈول حلق سے نکالنے کی تاب ہندوستانی سہل انگاری کب لاسکتی تھی - لہذا کھلک بنا دیا گیا - عین کو بھی ہندی کی نازکی کا شکار ہونا پڑا - اور بعض بعض کا باجا باجا بن گیا - ص - س - ث - کو ہندی نے ایک ہی لاٹھی سے ہانکا - اور حائے حطی اور ہائے ہوز بھی ہندی میں ایک دوسرے کو پہچاننا بھول گئیں - ض - ظ - ز وغیرہ ایک جیم میں منجمد ہو گئے - قاعدہ ہے کہ غیر الفاظ قبول کرنے سے پہلے زبان سُنار کی طرح انہیں اپنے مزاج اور میلان کی آگ میں ڈالتی ہے - پگھلنے کے بعد یہ الفاظ مختلف سانچوں میں ڈھلتے رہتے ہیں - ج - اہل عرب کو نہیں بھاتی تو عمل بذر گرسے چاوش ساؤش بن جاتا ہے - ٹ فارسی الیسی گوش نواز زبان میں نہیں کھپ سکتی - لہذا اکتارہ نے کتارہ کی صورت اختیار کی - درحقیقت ہر زبان کسی خاص ماحول میں پرورش پا کر ایک انفرادی

موج یا ترنگ اپنے میں ادا کر لیتی ہے۔ اور کسی دوسری زبان کے الفاظ کی دسترس اس تک اسی وقت ہو سکتی ہے۔ جبکہ وہ اسکے من کی موجوں کا خیال رکھے۔ نارنگی اچھا خاصا لفظ ہے۔ لیکن فارسی زبان کو پسند نہیں۔ یہ خوش مزاج چاہتی ہے کہ نارنج ہو۔ اہل فارس جن کی اپنی طبیعت کا عکس فارسی زبان میں ہے۔ نارنج کیوں نہ کہیں گے۔ آپ دیکھئے نارنگی ہو کہ نارنج بات ایک ہے لیکن زبان کا مزہ مختلف ہے۔

ان تمام انقلابات کو بنظرِ غور ملاحظہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں کے فلسفہ اور تصور پرستی کا ایک مسلسل عکس جو مدتوں ہندی پر پڑا تھا۔ اس سے زبان میں ایک میدانی سست رو دریا کا پھیلاؤ آ گیا تھا۔ ہندی زبان نہایت سیدھی سادھی اور صاف زبان تھی لیکن کم مایہ۔ اسکے الفاظ میں رس تھا۔ اس کے تصنع سے پاک جملوں میں گھلاوٹ موجود تھی۔ لیکن اس میں اس وسعتِ بیان کا فقدان تھا جو فارسی کا طرۂ امتیاز ہے۔ فارسی کے اچھوتے لفظوں تخیل میں رچی ہوئی ترکیبوں اور "جاوداں پیہم رواں ہر دم جواں" اشعار و مطالب نے ہندی مصنفوں کے دل موہ لئے۔ اس لئے یہ کہنا کہ فارسی زبان کا اثر ہندوستانی زبان پر قطعی حاکم و محکوم کے رشتہ کا رہین منت ہے قدرے سطحی نظریہ ہے۔ جھروکہ درشن ایسی ترکیب یقیناً سلطان کی خوشنودی کیلئے نہیں بنی۔ بلکہ ہندی اور فارسی الفاظ کے رسیلے الجھاؤ سے ایک بنیادی احساس اور ضرورت کی ترجمانی کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔

نویں صدی تک کی فارسی تصانیف میں ہندی الفاظ کے دخل کی رام کہانی میں مختصراً عرض کر چکا ہوں۔ اب ملک الشعرائے شاہجہانی ابو طالب کلیم کی ایک مثنوی کے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔ تاکہ وہ سلسلہ مغلیہ دور سے مربوط ہو جائے۔ دیکھئے کس بے تکلفی سے ہندی لفظ استعمال کرتا چلا جاتا ہے۔

منہ بر وعدۂ تنبولیاں دل — کہ جز خون خوردن از وی نیست حاصل
ز حسن شستہ دھوبی چہ گویم — ازاں بے پردہ محبوبے چہ گویم
بتانِ راجپوت و شیخ زادہ — شکیب عاشقاں بر باد دادہ
چہ چنبر شعلہ شمع ست بے دود — کہ آتش می زند بر خرمن عود

زمور و ناں نظر در یوزہ دارم — کہ وصفِ موسہری را بہ نگارم

مفردات سے قطع نظر مرکبات کی داستان سنئے جو اس سے کہیں زیادہ دلچسپ ہے۔ ان محاوروں کو ملاحظہ فرمائیے اور پھر اندازہ کیجئے کہ کس حد تک فارسی زبان ہندوستانی ماحول سے متاثر ہو چکی تھی

زمین خفتن۔ معنی "زمین پہ سونا" اس ہندوستانی رسم کا پتہ دیتا ہے جس سے سلاطین و شہزادگان کی وفات کے وقت ماتم داری کے ایام میں لوگ زمین پر سوتے تھے۔ چنانچہ امیر خسرو کہتا ہے۔

"وز زمیں خفتن ہمہ آفاق شد پہلو کبود"

بیڑہ تنبول گرفتن۔ "بیڑہ اٹھانا" اس محاورہ کے جو معنی غیاث اللغات میں لکھے ہیں۔ ان سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ محاورہ بھی ایک خاص ہندوستانی رسم کی خبر دیتا ہے۔ صاحب غیاث کے الفاظ ہیں "در زبانِ سابق در سلاطین ہند رسم بود کہ پیش امرا برائے انصرام رسانیدن مہم بیڑہ پان می انداختند۔ کسیکہ آنرا بر داشتے انصرام آں مہم بذمہ او واجب شدے"

ان کے علاوہ سینکڑوں ہندوستانی محاورے فارسی میں منتقل ہو گئے اور مستند مصنفین کے ہاں ملتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

آواز کردن (آواز دینا) - گفتار گفتن (بات کہنا) - مالا کلام کردن (کسی سودے کا انقطاع کرنا)۔ نیشکر با پیل خوردن (ہاتھی سے گنا کھانا) - ع نتواں نیشکر با پیل خوردن (خسرو)۔ دندان در شکم بودن (پیٹ میں داڑھی یا دانت ہونا) - ع چوں خربزہ دندانش درون شکم است (خسرو) - بیک چوب ہمہ را راندن (سب کو ایک لاٹھی سے ہانکنا) - ع

خسرو ز زبان شست گو ہر ہمہ را — پیدا و نہاں شست جو ہر ہمہ را
شد راندہ سناں تیغ و تیر از کلک — زیں گونہ بیک چوب مراں ہر ہمہ را

دست بگوش نہادن (کانوں پہ ہاتھ رکھنا)۔

جان بہ بینی رسیدن (ناک میں دم آنا) - ع

جان مردم رسید در بینی (خسرو)

چراغ برکردہ طلب کردن (چراغ لیکر ڈھونڈنا)۔

پگ از سر فرود آوردن (پگڑی اتارنا۔ بےعزتی کرنا)۔ چوں پگ از سر فرود

آوردند چہ حرمت ماند (شمس سراج) ۔
افیون فرود آوردن (افیون اُتر جانا) ۔
دوران آمدن (چکّر آنا)

خالہ کا گھر ۔ ایک ہندوستانی محاورہ ہے ۔ ضیا برنی یہی محاورہ استعمال کرتا ہے "چنانکہ خوردگان نازنیں در خانہ خالگاں مہماں روند"
ان کی خوشی اسی میں ہے ۔ خوشی ایشاں بریں است (مفرّح القلوب)
اپنی گرہ سے خرچ کرنا ۔ خرج و اخراجات از گرہ خود کردن (شمس سراج عفیف) ۔

جان ہے تو جہان ہے ۔ اول جان بعدہ جہان ۔ (مفرّح القلوب)
آدھی کو چھوڑ ساری کے پیچھے دوڑنا ۔ نیم نان گزاشتہ برائے تمام نان بُرد ۔
مجھ سے کیا لیگا ۔ از من چہ خواہد گرفت ۔ (مفرّح القلوب)
اگر اپنی خیریت چاہتے ہو ۔ اگر خیریت خود میخواہی ۔
ان تلوں میں تیل نہیں ۔ خالے برخش دیدم و گفتم کہ تل است ۔
گفتا کہ بر و نیست دریں تل تیلے (خسرو)

بعض الفاظ کے معنی میں ہندوستانی ماحول نے نئے مفہوم پیدا کر دئے ۔ جن سے اہلِ زبان کے کان نا آشنا رہے ۔ مثلاً
متحرک ۔ بمعنی چالباز ۔ یہی حال لفظ حرکت کا ہے ۔
کاہل ۔ بمعنی ڈرپوک ۔
خوش ۔ بمعنی شاد و خرم ۔ ایرانی فارسی میں بمعنی مرغوب آتا ہے
روشنائی ۔ بمعنی مرکب یعنی سیاہی ۔
سرکار ۔ بمعنی خزانہ ۔

چنانچہ تاریخ فرشتہ میں ہے ۔
"اگر حکم شود کہ تریاک مجرّب کہ در خطامی باشد و بالفعل ازاں در سرکار موجود است بیاوریم"
غصہ بمعنی خشم و طیش ۔ ایرانی فارسی میں بمعنی اندوہ گلوگیر استعمال ہوتا ہے

شد اندر غصہ شادی ثمان والا
مدد جست از پناہِ حق تعالیٰ (خسرو)

فارسی اور ہندی کی اس باہمی کشاکش اور کیمیا گری کی تصویر مغلیہ سلطنت کے عروج و زوال میں کھنچی ہوئی ہے ۔ مغل جب ہندوستان میں آئے تو شان و شوکت کے دلدادہ اور جوش و خروش کی زندہ مثال تھے ۔ آہستہ آہستہ ہندوستانی مزاج کے ضمیر نے ان پر اثر کیا ۔ ان کی شاعری جو اس وقت رزمیہ تشبیہوں اور استعاروں سے مملو تھی ۔ اب بزم طرب اور محفل عشرت کے کنایات میں کھو گئی ۔ قصیدوں میں جنگ و جدال کی رمزیں کم نظر آنے لگیں ۔ حتیٰ کہ محمد شاہ رنگیلے اور بہادر شاہ کے زمانے میں استعاروں اور تشبیہوں کی ماہیت بالکل ہی بدل گئی ۔ اور کیوں نہ بدلتی ۔ اُلوالعزمی اور حب جاہ کی جگہ سہل انگاری اور عیش و عشرت نے لے لی تھی ۔ درباری شاعر اپنے سرپرست کے بغیر زندہ ہی کس طرح رہ سکتا ہے ۔ اس نے وہی کچھ بیان کیا جو اسے نظر آیا ۔ فارسی کے اُبلتے ہوئے چشمے اب نرم رو دریا بن چکے تھے ۔ پہلے زلف کو کمند و چوگاں ۔ ابرو کو خنجر ۔ مژگاں کو تیر اور آنکھوں کو قاتل و سفاک باندھا جاتا تھا ۔ اب بنفشہ و سنبل ۔ یاسمن اور نرگس وغیرہ کو کامل استعاروں کا رتبہ حاصل ہوا ۔ قصیدہ کی جگہ غزل نے لے لی ۔ بلکہ ہزل کی آمد شروع ہو گئی ۔ تصوّف کو عروج ہوا ۔ ہندوستان کی فضا اسکے لئے موزوں تھی ۔ اسلامی تصوّف میں "گرو چیلہ" اور بھگتی مسلک کے پیرو طبقہ میں "پیر و مرید" کے الفاظ اپنائے گئے ۔ اس امتزاج سے دونوں زبانوں اور قوموں میں یگانگت پیدا ہونے لگی ۔ مغل اور ہندوستانی آرٹ اور کلچر نے ایک دوسرے کے قریب آنا چاہا ۔ اُردو زبان ان دونوں کے اثر و تاثر سے بنی سنوری ۔ لیکن اس کا ذکر میری تقریر کی حدود سے باہر ہے ۔

(بہ اجازت آل انڈیا ریڈیو دہلی)

یوسف ظفر

خود فریب

ترے حریمِ محبت میں آؤں گا امشب — جواں ستاروں کی کرنوں پہ گاتا آؤں گا

صدائے ماہ سے جب جھلملائینگے کوکب — چراغِ ساغر و مینا جلاتا آؤں گا

بہار تیرے لئے میرے دل کے داغ سہی — مرے لئے ترے عارض چمن بدامن ہیں

یہ میری آنکھوں کے آنسو ترے چراغ سہی — تری نگاہ سے میرے چراغ روشن ہیں

یہ سامنے کے دریچے میں دیکھ رازِ حیات! — کہیں زباں پہ نگاہیں ہیں، آنکھ میں باتیں

کہیں دھندلکے ہیں دن اور نور ہیں برسات — کہیں نہ دن ہے نہ ہنستی ہوئی سیہ راتیں

مگر نہیں — تری محفل میں آج آؤں گا

ہزار اشک ہوں آنکھوں میں مسکراؤں گا

دُکھ سُکھ

علی اطہر اور چیخوف

(مسلسل)

(ڈراما)

آیوانوف

روسی مشہور افسانہ نگار چیخوف کا ایک شاہکار

(چوتھا ایکٹ)

(ریوانوو کے مطالعہ کا کمرہ - ایک لکھنے کی میز جس پر کاغذات، کتابیں سرکاری لفافے، کھلونے اور ریوالور بے ترتیبی سے پڑے ہیں کاغذات کے قریب ایک لیمپ، دودھ کا قراب ایک رکابی میں مچھلی، کچھ روٹی، اور لکڑی کے ٹکڑے، دیواروں پر نقشے، تصویریں، بندوق، پستول درانتی اور کوڑے لٹکے ہوئے ہیں، دوپہر کا وقت ہے۔

شبیلسکی، لبیڈیو، بورکن اور پیوتر، شبیلسکی اور لبیڈیو لکھنے کی میز کے قریب بیٹھے ہیں، بورکن اسٹیج کے بیچ میں کرسی پر پیر پھیلائے بیٹھا ہے، پیوتر دروازے پر کھڑا ہے۔

لبیڈیو:- فرانس کی پالیسی واضح اور متعین ہے .... فرانسیسی جانتے ہیں کہ انھیں کس چیز کی ضرورت ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ سموسے کھانیوالوں کی کھالیں اور جرمنی کا قصہ بالکل مختلف ہے۔ جرمنی کے آنکھوں کے خار فرانس کے علاوہ اور بھی بہت سے ہیں ....

شبیلسکی:- مہمل .... میں سمجھتا ہوں کہ جرمن قوم بزدل ہے اور فرانسیسی بھی بزدل ہیں وہ صرف ایک دوسرے کے ساتھ زبان درازی کرتے ہیں۔ یقین جانو کہ معاملہ اس سے آگے نہیں بڑھیگا۔ وہ جنگ کبھی نہیں کریں گے۔

بورکن:- اور میرا خیال ہے کہ جنگ کی ضرورت بھی نہیں۔ آخر اس تمام اسلحہ بندی کانگریسوں اور اخراجات کا فائدہ کیا ہے؟ میں تمہیں بتاؤں کہ ایسی میں میں کیا کرتا۔ تمام ملک کے کتوں کو جمع کرکے ان کے جسم میں نشتر کے ذریعہ ایک مہلک مادہ پھیلا کر اور ان کو دشمن کے ملک میں چھوڑ دیتا۔ ایک مہینہ کے اندر اندر تمام دشمن کتے کے کاٹے سے دیوانے ہو جاتے

لبیڈیو:- (ہنستا ہے) اس کا سر دیکھنے میں چھوٹا ہے لیکن اس میں شاندار خیالات کی شدت ہے۔ جتنی سمندر میں مچھلیوں کی۔

شبیلسکی:- یہ ان معاملات کا تو ماہر ہے۔

لبیڈیو:- خدا بھلا کرے تمہارا مابیگل ماسلوچ تم دل خوش کر دیتے ہو (ہنسنا بند کر دیتا ہے) ہملوگ بک بک کئے جا رہے ہیں لیکن واڈکا کا کیا ہوگا۔ ایک دور اور (تین گلاس شراب بھرتا ہے) ہم لوگوں کی بہترین صحت کیلئے (سب پیتے ہیں اور کچھ کھاتے ہیں) ہماری پرانی سرخ ہیرنگ مچھلی بہترین ناشتہ ہے

شبیلسکی:- نہیں ککڑی زیادہ اچھی ہوتی ہے ..... دنیا کی پیدائش سے لیکر اب تک بڑے بڑے علما سوچ سوچ کر تھک گئے۔ لیکن نمک اور ککڑی سے بہتر کوئی چیز اب تک نہیں سوچ سکے (پیوتر سے) پیوتر جاؤ کچھ ککڑی لے آؤ اور باورچی سے کہو کہ ہمارے لئے چار پیاز کے سموسے تل دے اور گرم گرم بھیجے۔ (پیوتر باہر چلا جاتا ہے)

لبیڈیو:- واڈکا کے ساتھ کیویئر مچھلی بھی بری نہیں ہوتی لیکن اسکو استعمال ذرا سلیقہ سے کرنا چاہئے۔ ایک چھٹانک لیوتڑے کو دو۔ پرانی پیاز اور ذرا سے زیتون کے تیل میں ملا لو۔ ...

..... اور دو تین قطرے لیموں کا عرق ڈال کر کھاؤ.....

نہایت ہی لذیذ ہوتا ہے اور اس کی تو خوشبو حیرت انگیز ہوتی ہے

بورکن:- تلی ہوئی گجن مچھلی بھی واڈکا کے بعد بہت مزیدار ہوتی ہے لیکن اسے تلنے کا طریقہ معلوم ہونا چاہئے۔ صاف کرکے پاؤڈر وئی

کے گوادے میں ملاکر اتنا تلنا چاہئے کہ سوکھ جائے اور چبانے میں
کرکر کرنے لگے . . . . کر . . . . کر . . . کر . . . .

شیبلسکی:۔ کل مادام بیاکن کے یہاں ایک بڑی اچھی چیز کھانے میں آئی . . .
. . . . ساگ

لیبیڈیو:۔ میں کہوں . . . .

شیبلسکی:۔ لیکن خاص طریقہ سے پکائی ہوئی۔ یوں سمجھو کہ پیاز، کنول کی
پتیاں اور کئی طرح کے مصالحہ کے ساتھ ملاکر جیسے ہی ڈھکن اٹھایا گیا
ایک بھاپ نکلی اور خوشبو . . . . نہایت لذیذ

لیبیڈیو:۔ کیوں دوستو کیا خیال ہے، رہے ایک دو اور (سب پیتے ہیں)
ہماری بہترین صحت کیلئے (گھڑی دیکھتا ہے) مجھے افسوس ہے کہ میں
نکولائی کا انتظار نہیں کر سکتا۔ اب چلنے کا وقت ہو گیا ہے تم کہتے ہو
کہ تم نے مادام بیاکن کے یہاں ساگ کھایا اور ہم نے ابھی تک ساگ
دیکھا بھی نہیں۔ او ہاں یہ تو بتاؤ کہ تم نارخان کے یہاں کیوں گھسے
رہتے ہو؟

شیبلسکی:۔ (بورکن کی طرف اشارہ کرتا ہے) کیوں! آپ ان سے میری شادی
کرانا چاہتے ہیں

لیبیڈیو:۔ شادی! اے بھئی تمہاری عمر کیا ہے؟

شیبلسکی:۔ باسٹھ برس

لیبیڈیو:۔ شادی کرنے کی بہترین عمر! اور مارفا سے تمہارا جوڑا بہت خوب ہوگا۔

بورکن:۔ سوال مارفا کا نہیں اسکے آدمیوں کا ہے۔

لیبیڈیو:۔ اور بھی کچھ فرمائیے۔ مارفا کے روپئے اسکے بعد کرنے کا
حوصلہ کیجئے گا۔

بورکن:۔ جب انکی شادی ہو جائے گی اور جیب روپیوں سے لد جائیگی۔
تب کہے گا کہ کرنے کا حوصلہ ہے کہ نہیں۔ انکی قسمت پر آپکو
رشک آئے گا۔

شیبلسکی:۔ اور جانتے ہو آپ اس معاملے میں بڑے خلوص کا اظہار فرما رہے
ہیں ان علامہ زمان کو یقین ہے کہ میں وہی کروں گا۔ جو یہ فرماتے
ہیں۔ اس سے شادی بھی کروں گا۔

بورکن:۔ کیوں نہیں۔ یقینی۔ کیا تم کو بھی اس کا یقین نہیں؟

شیبلسکی:۔ تمہارا دماغ چل گیا ہے . . . . . مجھے کب اس کا یقین ہوا تھا

بورکن:۔ شکریہ . . . بہت بہت شکریہ۔ تو آپ مجھے بیوقوف بنانا چاہتے
ہیں۔ پہلے تو کہا کہ شادی کروں گا اور اب فرماتے ہیں کہ نہیں کرونگا
. . . . کون بیہودہ آپ کا مطلب سمجھ سکتا ہے۔ اور میں زبان
دے چکا ہوں۔ تو تم اس سے شادی نہیں کروگے؟

شیبلسکی:۔ (کندھے ہلاتے ہوئے) تم اسے سچ سمجھ بیٹھے۔ عجیب آدمی ہو

بورکن:۔ (غصہ میں) اگر یہ بات تھی تو ایک شریف خاتون کو پریشان کرنے سے
تمہارا کیا مطلب تھا؟ وہ تو کاؤنٹس ہونے کے پیچھے پاگل ہو رہی
ہے، نہ سو سکتی ہے۔ نہ کھا سکتی ہے . . . . اور آپ اسکو
مذاق سمجھ رہے ہیں۔ یہ شرافت ہے؟

شیبلسکی:۔ (انگلی اٹھاتے ہوئے) خیر اگر میں یہ حرکت کر ہی بیٹھوں تو میرا
کیا ہوگا! صرف شرارت کیلئے میں جاکر شادی کر ہی لیتا ہوں۔
واللہ . . . بڑا تماشا ہوگا۔

(لووو داخل ہوتا ہے)

لیبیڈیو:۔ ڈاکٹر صاحب تسلیمات عرض ہے (لووو کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے
اور گاتا ہے) ڈاکٹر صاحب خدا کیلئے مجھے بچائیے۔ جناب مجھ پر
موت کی ہیبت طاری ہے۔

لووو:۔ کیا ابھی تک نکولائی ایلکزیوچ نہیں آئے؟

لیبیڈیو:۔ جی نہیں۔ میں ایک گھنٹہ سے ان کا انتظار کر رہا ہوں (لووو
یہ میں اسٹیج پر ٹہلتا ہے) کیوں بھائی انا پیٹرووناکیسی ہے

لووو:۔ بہت بیمار ہے۔

لیبیڈیو:۔ (ٹھنڈی سانس لیتا ہے) کیا میں جاکر عیادت کر سکتا ہوں؟

لووو:۔ نہیں مہربانی کرکے نہ جائیے! میرا خیال ہے وہ سو رہی ہے . . . .
. . . . . (وقفہ)

لیبیڈیو:۔ وہ بہت نیک عورت ہے (ٹھنڈی سانس لیتا ہے)۔
ساشا کی سالگرہ میں جب وہ میرے یہاں بیہوش ہوئی تو میں نے
اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ بیچاری زیادہ عرصہ
تک زندہ نہیں رہیگی۔ معلوم نہیں اسکو کیا ہو گیا تھا۔ جب میں
دوڑ کر اسکے پاس گیا تو دیکھا وہ لیٹی تھی اور موت کی زردی اسکے

چہرہ پر چھائی ہوئی تھی۔ اسکے پاس نکولائی گھٹنے ٹیکے بیٹھا تھا۔ اور
اتنا ہی زرد ہو رہا تھا جتنی وہ اور ساشا رو رہی تھی ایک ہفتہ تک
میری اور ساشا کی یہ حالت رہی گو یا ہم لوگ چند ھیا گئے ہیں۔
شیبلسکی:۔ (لوووسے) سائنس کے معزز علمبردار ذرا یہ تو بتایئے کہ وہ کون
عاقل دوراں تھا جس نے یہ پتہ چلایا کہ جن عورتوں کے سینے کمزور
ہوتے ہیں انھیں نوجوان کی زیادہ آمد و رفت سے فائدہ ہوتا ہے
یہ بڑی عظیم الشان تحقیق ہے یہ کس کا کارنامہ ہے! ایلو پیتھک کا
یا ہومیو پیتھک کا؟
(لووو جواب دیتے دیتے رک جاتا ہے اور ایک نفرت آمیز نظر
ڈال کر چلا جاتا ہے)
شیبلسکی:۔ کیسی خشک کر دینے والی نظر تھی . . . .
لیبیڈیو:۔ معلوم نہیں کس شیطانی جذبہ میں تمہاری زبان اس طرح
چلنے لگتی ہے۔ اسکی توہین کیوں کی تم نے؟
شیبلسکی:۔ (چڑاونے انداز میں) تو وہ جھوٹ کیوں بولتا ہے۔
یہ سب جھوٹ ہے میں اسے برداشت نہیں کر سکتا
لیبیڈیو:۔ آپ کیسے جانتے ہیں کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے؟
شیبلسکی:۔ (اٹھ کر ٹہلنے لگتا ہے) میں یہ خیال برداشت نہیں کر سکتا کہ
ایک زندہ مخلوق بلا کسی وجہ کے مر جائے۔ چھوڑو اس موضوع کو
(کوشم داخل ہوتا ہے)
کوشم:۔ (ہانپتا داخل ہوتا ہے) کیا نکولائی الیکزیوچ گھر پر نہیں؟
اداب عرض ہے (جلدی جلدی سبھوں سے ہاتھ ملاتا ہے) کیا وہ
گھر پر نہیں؟
بورکن:۔ نہیں وہ باہر گئے ہوئے ہیں۔
کوشم:۔ (بیٹھتا ہے اور پھر جھٹکے کے ساتھ اٹھتا ہے) اگر ایسی بات ہے
تو خدا حافظ (ایک گلاس شراب پیتا ہے اور پھر جلدی جلدی کچھ
کھاتا ہے) میں جاتا ہوں . . . . بہت مصروف ہوں . . .
. . . تھک کر چور ہو گیا ہوں . . . . کھڑا ہونا بھی مشکل ہو رہا ہے . . .
لیبیڈیو:۔ تم نازل کہاں سے ہو گئے؟
کوشم:۔ بار بانو کے یہاں سے . . . . . . ہم لوگ رات بھر ونٹ کھیلتے
رہے۔ ابھی ابھی ختم کیا ہے . . . . میں تو پٹ گیا . . . . . .
وہ بار بانو چمار کی طرح کھیلتا ہے! (رونی آواز میں) ذرا سنو۔
میں برابر پان کھیل رہا ہوں . . . . (بورکن کو مخاطب کرتا ہے
وہ کھسک جاتا ہے) وہ ٹھکری چل پڑا لیکن میں پھر پان کھیلا، وہ
پھر ٹھکری چل پڑا . . . . نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہاتھ بھی نہیں بنا سکا۔
(لیبیڈیو سے) ہم لوگ چار چڑیا بولے۔ میرے ہاتھ میں ایکہ بیوی
اور پانچ اور چڑیا کے پتے اور حکم کا ایکہ دہلا دو اور پتے تھی . . .
لیبیڈیو:۔ (کانوں میں انگلیاں دیتے ہوئے) رحم کیجئے، خدا کیلئے مجھے
بخشئے۔
کوشم:۔ (کاؤنٹ سے) دیکھتے ہیں جناب، ایکہ، بیوی، چڑیا کے
پانچ اور پتے ایکہ اور دہلا دو اور حکم . . . .
شیبلسکی:۔ (اس کو ہٹاتے ہوئے) چلے جاؤ میں تمہاری بات نہیں سننا چاہتا
کوشم:۔ اور لیکا یک ایسی بد قسمتی کے حکم کے ایکہ پر پہلے ہی ہاتھ میں ٹرمپ
ہو گیا۔
شیبلسکی:۔ (میز پر سے ایک ریوالور اٹھاتے ہوئے) چلے جاؤ نہیں تو میں
تمہیں گولی مار دوں گا۔
کوشم:۔ (ہاتھ ہلاتا ہے) برا ہو اس کا . . . . کیا ایک بھی ایسا آدمی نہیں
جس سے میں کچھ باتیں کر سکوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں آسٹریلیا
میں پہونچ گیا ہوں، نہ کوئی مشترک دلچسپی ہے نہ ایک دوسرے
سے ہمدردی . . . . سب کے سب اپنے آپ میں مگن ہیں . . . .
. . . خیر مجھے چلنا چاہئے . . . . . . دیر ہو گئی۔ (اپنی ٹوپی جھپٹ کر
اٹھا لیتا ہے) وقت قیمتی ہے (لیبیڈیو سے ہاتھ ملاتا ہے) پاس
(قہقہہ) (کوشم چلا جاتا ہے اور دروازہ میں اودوتیا سے ٹکرا کھاتا ہے)
اودوتیا:۔ (چیختی ہے) خدا غارت کرے مجھے دھکا دیتے ہو۔
سب لوگ:۔ آ۔ آہ۔ یہ تو ہر جگہ موجود رہتی ہے۔
اودوتیا:۔ تو تم سب لوگ یہاں ہو اور میں نے گھر بھر ڈھونڈھ ڈالا۔
گڈ مارننگ۔ میرے چمکتے ہوئے فاختو۔ کھانے کا مزہ لے رہے ہو؟
(سبھوں کو خوش باش کہتی ہے)

لیبیڈیو:۔ آپ کس غرض سے تشریف لائے ہیں؟

اودوتیا:۔ کام ہے جناب والا (کاونٹ سے) ایسا کام جس کا تعلق۔ آپ سے ہے حضور عالی ۔ (جھکتی ہے) مجھے حکم ملا ہے کہ آپ کو سلام کہوں اور خیریت دریافت کروں ...... میری خوبصورت گڑیا نے مجھے تم سے یہ کہنے کا حکم دیا ہے کہ اگر آج شام تم آکر اس سے ملاقات نہیں کروگے تو وہ رو رو کر اپنی آنکھیں پھوڑ ڈالے گی۔ اس نے کہا، مائیڈیر اس کو الگ لیجاکر کان میں رازدارانہ طریقہ پر کہنا۔ لیکن رازداری کی کیا ضرورت ہے، یہاں پر ہم سب ایک دوسرے کے پرانے دوست ہیں۔ اسکے علاوہ کچھ گناہ تو کر نہیں رہے ہیں۔ ہم تو فریقین کی رضامندی اور محبت کے ساتھ جائز طریقہ پر شادی کرانا چاہتے ہیں۔ یوں تو میں ایک گنہگار عورت ہوں لیکن ابتک شراب کا ایک قطرہ بھی چکھنے کی جرأت نہ کی تھی۔ مگر اس موقع پر ایک گلاس پیوں گی۔

لیبیڈیو:۔ اور میں بھی ایک گلاس پیوں گا۔ (گلاس بھرتا ہے) اور بڈھی کبوتری تم پر تو سن و سال کا کوئی اثر بھی نہیں معلوم ہوتا تم اس وقت بھی کافی بوڑھی تھیں جب تیس سال قبل میں تم سے پہلے پہل ملا تھا۔

اودوتیا:۔ اب تو میں سالوں کا شمار بھی بھول گئی۔ . . . دو شوہروں کو دفنا چکی ہوں۔ تیسرے سے بیاہ کرنا چاہتی ہوں لیکن جہیز کے بغیر کوئی مجھے قبول ہی نہیں کرنا چاہتا۔ آٹھ لڑکے ہوئے ...... (گلاس اٹھاتی ہے) خیر خدا کرے کہ ہم لوگوں نے یہ نیک کام جو شروع کیا ہے اسکی مہربانی سے انجام کو پہونچ جائے۔ یہ دونوں زندہ رہیں گے۔ پھلے پھولیں گے اور ہم لوگ ان کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوں گے۔ اللہ کرے، دونوں میں محبت اور یگانگت ہو (پیتی ہے) یہ تو کڑوی ووڈکا ہے

شیبلسکی:۔ (ہنستے ہوئے لیبیڈو سے) لیکن جانتے ہو بڑا طرفہ یہ ہے کہ لوگ واقعی سمجھتے ہیں کہ میں ...... حیرت انگیز بات ہے (اٹھ جاتا ہے) کیا خیال ہے تمہارا پادشا ما واقعی میں یہ یہ حرکت تیرے کر ہی ڈالوں۔ صرف شرارت کے لئے ....

بڈھا کتا ہڈیاں کیوں نہ چبائے پاشا این؟

(باقی)

یہ کوشش عبث کوشش تو رہی ہے۔ سال گزری ہو سیکڑ کر سمجھنے والا سمجھ سکا ہوں نہیں تو آپ کے پر اکوشش کا کم بحق یا نہیں !!

قاضی عبدالغفار

پیش لفظ

کسی دلدوز نغمہ پر اظہار ستایش کرنا، کہ ارباب محفل نقادِ فن سمجھ کر داد کی داد دیں۔ کھلی ہوئی بازاریت ہے "پیش لفظ" پڑھ کر جو طوفان اٹھے ان کے بیان پر نہ قدرت ہے نہ اظہار ستایش کی ہمت۔ کہنا صرف یہ ہے کہ یہ شاہکار ایک تصنیف کا نامکمل دیباچہ ہے جو قاضی عبدالغفار صاحب نے بیگم ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے اصرار سے "جہاں نما" کے لئے عنایت کیا، اور بیگم صاحبہ نے ایشا کو عطا فرما دیا۔

(ساغر)

روحوں میں طوفان اٹھتے ہیں جس طرح سمندروں میں — ایک ایسے ہی طوفان میں کسی کشتی کے غرق ہونے کا یہ قصہ ہے۔ اگر آپ سمجھنا بھی چاہیں تو سن لیجئے اور اگر سمجھنے میں کچھ زحمت ہو تو شکایت نہ کیجئے۔ کہنے والا اس بات کا ضامن نہیں کہ آپ سمجھ بھی جائیں گے!۔

اس سمندر کا داستان گو نہ جانے کب سے اپنی داستان بیان کر رہا ہے اور نہ جانے کب تک بیان کرتا رہیگا۔ لیکن اس داستان کا انجام نہ وہ بیان کر سکا اور نہ کوئی سننے والا اس کا تصور کر سکتا ہے۔ طوفان کی ایک موج یہ داستان بھی ہے لیکن پھر کیا ہوگا اگر اس موج کو اسکے سمندر سے جدا کر دیں؟ میں جانتا ہوں کہ یہ آپ کے بس کی بات نہیں۔ یعنی موج سے شناسائی اور سمندر سے بیگانگی!۔

ان طوفانوں میں جتنی ان گنت موجیں ہیں اتنی ہی لاتعداد کشتیاں ہیں۔ ہر موج کو جو اٹھتی ہیں آپ شمار کیجئے اور ہر کشتی کو جو غرق ہوتی یا چٹان سے ٹکراتی ہے یا موجوں کے تھپیڑے کھا کر کسی ویران ساحل پر الٹ جاتی ہے آپ گن لیجئے۔ ان کشتیوں میں بہت سی ایسی بھی ہوتی ہیں جن کو موجوں نے کسی پتھریلے ساحل پر پٹک دیا اور پھر کسی دن سمیٹ کر لے گئیں۔ ان ٹوٹی ہوئی کشتیوں کو بھی موج کے آغوش میں جگہ ملتی ہے۔ وہ بار بار ٹپکی جاتی ہیں اور بار بار اسی آغوش میں سمیٹ لی جاتی ہیں! جب تک ان کا ایک تختہ بھی باقی ہے ان کے اور موج کے درمیان یہ لگن باقی رہتی ہے — تم اسے فلسفہ کہو گے میں اسے کیفِ حیات کہتا ہوں!۔

یہ ایک چھوٹی سی پُورانی کشتی تھی — کوئی بڑا جہاز نہ تھا — جس کا حال تمہیں سناتا ہوں۔ اس کشتی کے بادبان پارہ پارہ ہو چکے تھے اور اسکے پتوار ٹوٹ چکے تھے اور ملاح کی نوازشوں سے وہ محروم ہو چکی تھی۔ پھر بھی وہ تھی ایک کشتی۔ کتنی ہی سخت اور پھسلواں چٹانوں پر وہ پٹخی گئی۔ کتنے ہی ساحلوں پر اوس نے تنہائی کے دن اور کس مپرسی کی راتیں بسر کیں۔ لیکن جن موجوں نے اسکو پٹخا تھا وہی اسکو اٹھا کر لے گئیں — پروردگان آغوش موج کی یہ داستان کوئی نئی تو نہیں ہے!۔

کسی ملاح نے موج اور کشتی کے اس لگاؤ کو اپنی ایک مثنوی میں بیان کیا تھا اور کہا تھا کہ:۔

"موج اور کشتی الگ الگ دو نام ہیں لیکن حقیقت
ایک ہے حقیقت میں یہ دو موجود ہیں۔ کشتی کے بغیر
موج کی نمود کیا ہے؟ سوائے اسکے کہ وہ سمندر کی
ایک ٹھوکر ہے اور بغیر موج کے کشتی کیا ہے؟ سوائے
چند تختوں کے جن کو بڑھئی نے اپنی آری سے کاٹا
تھا اور اپنے ہتوڑوں سے کوٹا تھا"

شاعر کے ان تصورات کو تم جب زندگی کے سانچے میں ڈھالکر دیکھو گے تب تم کو یہ خبر ملے گی کہ جس طرح سمندر بغیر موج کے بیجان ہے اسی طرح موج بغیر کشتی کے اپنی قوت پر مغرور اور سر بلند نہیں ہو سکتی سمند

میں موج کا رقص اور موج کے رقص میں کشتی کی گردش —— نقطۂ تکمیل ہے
اور شاید اس کو انسانوں کی اصطلاح میں جوانی کہتے ہیں!۔

مجھے معلوم نہیں کہ کشتی کتنے چشموں اور دریاؤں سے گزرتی ہوئی کتنے ساحلوں کو چھوتی ہوئی کتنے سمندروں کے سینہ پر اچھلتی ہوئی کتنے بادلوں کی کڑک اور کتنی بجلیوں کی تڑپ سے آشنا ہوتی ہوئی۔ اس بظاہر آخری طوفان کے دامن تک پہونچی تھی جس سے میری داستان کا آغاز ہوتا ہے۔ بہرحال میں نے اُسکو ایک ویران جزیرہ کے پتھریلے ساحل پر بہت شکستہ حالت میں پایا۔ وہ ایک تھکے ہوئے مسافر کی طرح سے اون قافلوں کا خروش سن رہی تھی جو سمندر کے طوفان میں گزر رہے تھے لیکن اُن تک پہونچ نہیں سکتی تھی —— اسکی خستگی اور درماندگی سراپا انتظار تھی —— اُسکی تھکن میں بھی آغوش موج کے ہنگاموں کی تمنائیں بیدار تھیں!۔

جاڑوں کی یہ رُت تھی۔ ویران جزیرہ کے ساحل پر وہ آخری منظر میں نے دیکھا تھا، جب پرخروش اور غضبناک سمندر کی بے پروا موجوں نے اس کشتی کو اتنے چکر دئے تھے۔ اتنی دفعہ اچھالا اور گرایا تھا کہ اس کے رقص کی ہر لرزش سے ایک ایسی تھکن مترشح ہونے لگی تھی جسکو دنیا کے لوگ بڑھاپے کے نام سے یاد کرتے ہیں!۔ لیکن کیا طوفان کی موجوں کے جھکولوں سے جدا ہو کر ساحل کی چٹانوں پر بکھر جانا کوئی ایسی انتہا ہے جو پھر کبھی اپنے آغاز کی طرف رجوع نہ ہوگی؟۔ یا اگر یہ مکان باقی ہے کہ کسی دن پھر کوئی موج اس اوندھی کشتی کو یا اسکے ٹوٹے ہوئے تختوں کو اپنی دامن میں لپیٹ کر لیجائیگی اور سمندر کے سینہ پر رکھدیگی تو پھر کیا ان ٹوٹے ہوئے تختوں کی یہ انتہا بھی انکے آغاز ہی کا دوسرا نام نہیں ہے؟ اور نہیں تو پھر کیا ہے؟۔

موسم سرما کی اندھیری رات تھی جس کی ظلمت کے سینہ میں ایک بے اختیار آرزو کی طرح، ایک بے محابا تمنا کی صورت۔ بجلی چمک رہی تھی کہ گویا غضبناک دیوتاؤں کی فوجیں مصروف پیکار ہیں۔ ان دیوتاؤں کے سمندر کا نیلا پانی رات کی سیاہی سے اتنا سیاہ فام تھا کہ اگر چٹانوں کی سختی موجوں کے منہ میں کف پیدا نہ کرتی جس کے دھبے بجلی کی چمک کے ساتھ نظر آرہے تھے تو آسمان و زمین کی وسعتوں میں ایک زہرہ گداز خروش کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہا ہوتا۔ موجوں کے سینہ کو کشتیوں کی پتوار شیر کے پنجہ کی طرح چیر رہے تھے۔ ہوا کا وہ فراٹا۔ بادل کی گرج اور چٹانوں پر موجوں کے تھپیڑوں کی آواز —— ارض و سما کی درمیانی وسعت میں یہ سارا خروش بقا سے فنا اور فنا سے بقا کی منزلوں کا ایک پھیلاؤ تھا جس میں اس مضطرب کشتی کی جوانی نے ہزار دفعہ بڑھاپے کی منزلیں طے کیں اور ہزار دفعہ اپنے بڑھاپے سے جوانی کی طرف عود کیا!۔ یہ ہر آن اور ہر لمحہ کی ایک مسلسل داستان ہے برف سے زیادہ ٹھنڈے پانی کی پرخروش موجوں کے عریاں شانوں اور مضبوط بازوؤں پر برف کے گالے اس طرح گر رہے تھے کہ اگر تاریکی نہ ہوتی تو سارا عالم سفید ہی سفید نظر آتا

ہر نئی موج کے تھپیڑے میں اس کشتی کے شکستہ پتواروں کی چڑچڑاہٹ کی آواز آنیوالے بڑھاپے اور جانیوالی جوانی کی کشمکش کا ایک کرب ناتمام تھا۔ جس میں موج کے بازو کی قوت ایک طرف اور کشتی کا زندہ رہنے پر اصرار دوسری طرف اپنے ارادوں کو آزما رہا تھا۔ ہر تھپیڑے کے بعد یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہی تھا، آخری ضرب ہے لیکن مضطرب سمندر کی کھلی ہوئی گود میں کشتی کے تختوں کی مسکراتی ہوئی دراز ہر موج سے یہ کہتی سنائی دیتی تھی کہ

"میں کیونکر فنا ہو سکوں جب تک کہ تو باقی رہے"،

ویران جزیرے کے ساحل پر شاعر کی چشم نگراں اس کشمکش کو دیکھ رہی تھی اور فلسفی حیران تھا کہ اگر اس طوفان زندگی کا کوئی آخری مقام بھی ہے تو وہ کہاں ہے۔ کہاں ہے کوئی ایسا سکون مطلق جسکی خاموش وادیوں میں سمندر سو جائے اور موج بے خروش ہو جائے!۔

ابھی مشرق کی حد نظر پر ایک سرخ پردہ کی جھالر کو سمندر کی موجیں اپنے دامن سے دھو رہی تھیں اور رات کی تھکی ہوئی کشتی نے ساحل کے

سامنے دم لینا چاہا تھا کہ یکایک کسی زیادہ شوخ موج نے اسکے نیچے کاندھا مارا اور پہلے اس سے کہ یہ سفینہ صبح کے سکوں میں موج کی اس شوخی کے خلاف کوئی احتجاج کرے۔ صرف ایک ہی جھکولے میں وہ ساحل کی چٹان پر پھینک دیگئی۔ زندگی میں بہت سے دن ایسے ہوتے ہیں جب سورج نکلتا ہے مگر صبح نہیں ہوتی یا جب صبح ہو جاتی ہے مگر سورج نہیں نکلتا! لیکن زندگی کی بہت سی وحدتیں جو صبح کا انتظار کرتی ہیں یا سورج کو دیکھنے کی تمنا رکھتی ہیں۔ غلطی یہ کرتی ہیں کہ شاعر سے مشورہ کئے بغیر مایوس ہو جاتی ہیں! ان بدنصیبوں کو خبر ہی نہیں ہوتی کہ کسی دن ایسا بھی ہوتا ہے کہ صبح اور سورج دونوں ساتھ ساتھ آتے ہیں۔ سورج کی کرنیں صبح زندگی کے دامن سے لپٹی ہوئی آتی ہیں۔ یہ صبح بہت روشن ہوتی ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ رات بھر کے طوفان کے بعد ہی وہ آتی ہیں!۔

غضبناک سمندر نے آخری جھکولے سے کشتی کے تختوں پر کیلیوں کی گرفت بہت ڈھیلی کردی تھی اور ساحل کی ناہموار سطح پر دور سے یہ ایک دھبہ سا نظر آتا تھا جس پر موجیں اپنے جھاگ اڑا رہی تھیں ــــــ اس طرح جیسے برات کے دولہا کی سواری پر یا کسی تابوت پر پھول برسائے جاتے ہوں!۔ دولہا کی سواری اور جنازہ کا درمیانی فاصلہ اتنا کم ہے کہ شاعر یا فلسفی جب جنازہ سے برات تک اور برات سے جنازہ تک منزلیں شمار کرتا ہے تو موت وحیات کے اس محور پر کچھ بھی نہیں پاتا سوائے ایک ”عزم حیات“ کے۔ اس کی نظر میں کشتی کا ٹوٹا ہوا ہر تختہ بجائے خود ایک کشتی ہے! . . . .

شام

صاحبزادہ محمد علی خاں میکش
حیدرآبادی

چھین لے، اس ظلمت و انوار کی دُنیا سے شام
جستجوئیں نامکمل، آرزوئیں ناتمام
اپنے دامانِ شفق کو کر بھی لے رنگین تر
نوجوانی دے رہی ہو، لے تجھے خونِ جگر

آسماں پر نور و ظلمت کا یہ ہلکا اتصال
جیسے دُلہن کے دھڑکتے دل میں دُھندلے سے خیال
ٹہنیوں پر یہ تھکے ماندے پرندوں کی پکار
جیسے پھولوں کی ہنسی میں چند لمحوں کی بہار
ڈوبتے خورشید کی یہ نیم جاں پرچھائیاں
نیند سے پہلے کی جیسے مضمحل انگڑائیاں

چھا رہا ہے پھر اندھیرا، جل رہے ہیں پھر چراغ
نااُمیدی میں چمک دکھلا رہے ہیں دل کے داغ
ایک گہری فکر میں کھویا ہوا ہے پھر شباب
بن رہے ہیں ”آج“ کی آنکھوں میں ”شاید“ کل کے خواب
رقصِ انجم کے لئے بزمِ فلک کا اہتمام
لے رہا ہے پھر مرے اشکوں سے اندازِ خرام
ہو رہی ہے زندگی پھر ایک خاموشی میں گُم
اک فریبِ مرگ میں، اک خود فراموشی میں گُم

تُو جو آئی، غم کو حُسنِ جاودانی مل گیا
آخری سانسوں کو ذوقِ زندگانی مل گیا

عبدالرشید عرفاں

رکشا والا

"دیوی جی! آپ روزانہ کوٹھی جاتی ہیں نا؟"

"ہوں ——— کیوں؟"

"یونہی ——— اگر ——— قریب ہی کے رکشا پر" ——— یہ کہہ کر رکشا والا ملتجی نگاہوں سے تکنے لگا۔

"اُف! بہت گرمی ہے ذرا تیز چلو" ——— ایک مرتبہ رکشا نے ذرا زور سے ہچکولا کھایا، تھوڑی دور چلنے پر رفتار پھر دھیمی ہو گئی جیسے رکشا والے کی بھدی پنڈلیوں کے اُبھری ہوئی رگوں میں خون جم کے رہ گیا ہو، اس نے انگوچھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

"سچ مچ بہت گرمی ہے، تھوڑی ہی دور میں جان نکل گئی ——— ہاں تو روزانہ اسی وقت آپ کوٹھی جاتی ہوں گی ———!؟"

"نہیں اس سے کچھ سویرے ہی، آج کچھ دیر ہو گئی ہے ——— بس بس آہستہ سامنے والی کوٹھی ہیں۔"

"بہت اچھا سرکار"

"کے پیسے ہوئے تمہارے؟" ———

"ہونھ! بھلا آپ نہیں جانتی ہیں ——— ہیں ہیں" ——— رکشا والے نے ایک کثیف ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا، "روز کا آنا جانا رہا ہوگا، آپ سے کیا چھپا ہے سرکار؟" ———

"اچھا یہ لو اور دیکھو کل ساڑھے آٹھ بجے ہی ہم کو فرصت ہو جائیگی، کل سنیچر ہے اور ہاں سنو! پرسوں اتوار ہے، تم جانتے ہو نا کہ اتوار کو چھٹی رہتی ہے؟" ———

"جانتے ہیں دیوی جی! ——— ہم بھی جب ———!!" جیسے رکشا والے کے سامنے اس کے طالب العلمی کے زمانہ کا سارا اتوار ناچ گیا ہو

"کیا تم بھی جب ———؟"

"کچھ نہیں ——— یہی کہ ہم بھی جب پڑھتے تھے تو ———!"

"اچھا! تم بھی کبھی پڑھتے تھے ———؟ ——— تم نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ہے رکشا والے؟"

"یہی معمولی سی چند کلاسیں سرکار" ———

"آخر کہاں تک تم نے پڑھا ہے؟" ———

"کیا کیجئے گا پوچھ کر سرکار؟" ——— "کل ٹھیک وقت پر ہم ضرور پہونچ جائیں گے، دیکھئے دوسرا رکشا نہ کر لیجئے گا ———"

——— اُس نے پیسوں کو انٹی میں رکھا۔ اور پاس والے نیم کی چھاؤں میں جا کر پسینہ سے تر گنجی کو اُتار کر ہوا دینے لگا، جب ذرا جان میں جان آئی تو پائپ پر جا کر منہ ہاتھ دھویا، پانی پیا اور پھر بڑبڑانا شروع کیا۔

"کتنی شریف ہیں یہ؟ آج کل کون غریب پر نظر کرتا ہے، کرایہ بھی تو بیجا نہیں دیا، دو پیسے زائد ہی دیدیئے، کل کہدوں گا، سرکار دو پیسے بیشی آپ نے دیئے ہیں ——— لیکن ——— شاید برا مانیں، بڑوں سے زیادہ بولنا بھی تو ٹھیک نہیں، مگر کل یہ ضرور پوچھوں گا اُس طرف سے کس کے رکشا پر آتی ہیں، شاید میرے ہی رکشا پر!"

——— کشور نے بھی کبھی اچھے دن دیکھے تھے لیکن آسمان تو کسی کے دن ہمیشہ یکساں نہیں رہنے دیتا ——— گاؤں میں جو ہیضہ کی وبا پھیلی تو خاندان کا خاندان اجڑ گیا، ایک ایک مکان سے بہ یک وقت پانچ پانچ، چھ چھ لاشیں نکلتی تھیں، کوئی جنازہ اٹھانے تک کو نہیں تھا ——— بُرا ہو لڑائی کا، شاید کہیں سے "کالرا فیج"، شیشیوں میں بند ٹرین سے جا رہے تھے ان میں سے کچھ شیشیاں کسی طرح ٹوٹ گئیں اور پورے گاؤں میں ہیضہ پھیل گیا ——— جگت پور جو آج کل ایک ویران اُداس اور سنسان بستی ہے کچھ دنوں پہلے پھلا پھولا، صدا بہار گاؤں تھا، نہ جانے کشور نے اُس جنم میں کون سا اپرادھ کیا تھا یا کمزور مزدور اور غریب

کسانوں پر اس کے آبا و اجداد کے بے جا ظلم و تشدد کا ثمرہ تھا یہ کہ جسکی سزا وہ رکشا والا ہو کر بھگت رہا تھا۔ لوگ کہتے ہیں ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے، بہت ٹھیک کہتے ہیں لوگ۔ کشور آخر کرتا کیا، اس نے تعلیم بھی تو زیادہ نہیں پائی تھی، دسویں جماعت تک وہ بھی حقیر سے قصبے کے اسکول میں ——— آج کل تو کتنے بی۔ اے مارے مارے پھرتے ہیں۔ افلاس کی شدت اور بھوک نے سینکڑوں کو ادنیٰ نکمّوں کی خانہ پری کیلئے آمادہ کر دیا ہے۔ کشور تو انکے مقابلہ میں کم پڑھا لکھا اور اجڈ دیہاتی تھا ——— پھر بھی ایک تعلیم یافتہ سے زیادہ پاک طینت! ——— مگر پاک طینتی پیٹ نہیں بھر سکتی۔ اسے اپنا پیٹ پالنا تھا ——— گاؤں کے کسی بھلے مانس نے رائے دی ہوگی۔ بھیّا! تم ابھی بھگوان کی دیا سے جوان مضبوط، اور تندرست ہو۔ پڑھے لکھے ہو شہر کیوں نہیں چلے جاتے؟ وہاں کسی کے لڑکے کو پڑھانا اور کچھ نہیں تو کم از کم بھر پیٹ کھانے کو تو مل ہی جائیگا! مصیبت کے وقت ذرا سی دلجوئی بھی انسان کے لئے بڑا سہارا ہوتی ہے۔ فلک زدہ کشور کے سامنے ایک دھندلا سا پُر امید مستقبل ناچ گیا۔ اُس کے خیال میں ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اسی روز پو پھٹتے ہی اُس نے باپ دادا کی نگری کو خیر باد کہنے کی ٹھان لی۔ شہر جاتے وقت اُسکے قدم من من بھر کے ہوگئے تھے۔ وہ چلا جا رہا تھا اور مڑ مڑ کر اپنی جنم بھومی کو تکتا جاتا تھا ——— وہ جا رہا تھا، پُر بہار باغوں ہرے بھرے کھیتوں، پُل اور اپنے کنوئیں کی منڈیروں کو چھوڑ کر جہاں گاؤں کی حسین و اُلّھڑ کنواریاں پانی بھرنے آتی تھیں ——— وہ چلا جا رہا تھا۔ بھوک کا مارا ہوا، اُن حسین اور رسیلے نغموں کو چھوڑ کر جو برکھا کی سہانی رات میں دیہاتی سندر کنواریاں مست ہو ہو کر چھیڑا کرتی تھیں ——— اسے بچپن کے خوشگوار دن رہ رہ کر یاد آ رہے تھے وہ درختوں کو یاس میں ڈوبے ہوئے آنسوؤں سے آلودہ نگاہوں سے دیکھتا تھا، درختوں کی ڈالیوں کو تو عالم وارفتگی میں بے تحاشا پکڑ پکڑ کر چومتا جاتا تھا ——— لیکن وہ آگے ہی بڑھتا جاتا تھا کیونکہ اسے آگے ہی بڑھنا تھا ——— وہ زمانہ بیتے ابھی زیادہ دن نہیں گزرے تھے جب یہ اپنے ہمجولیوں کے ساتھ دن دن بھر انہیں شاخوں پر ڈنڈ پٹا کھیلتا تھا، اسکی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں، لیکن اس کے قدم آگے ہی اُٹھتے جاتے تھے، کوئی اجنبی طاقت اسے روکتی تھی لیکن کوئی نامعلوم جذبہ اسے اپنی طرف کھینچتا تھا ——— دن چڑھے وہ شہر میں پہنچ گیا در در کی خاک چھان ماری لیکن ہر جگہ ناکامی و محرومی، یہانتک کہ فاقوں کی نوبت پہنچی کیونکہ ایک دیہاتی اگر تلاش معاش میں شہر آ کر کم از کم ایک دو وقت فاقہ نہ کرلے تو وہ دیہاتی کیسے کہلا سکتا ہے ——— ——— پر پیٹ کی مار بڑی ہی بری ہوتی ہے، مرتا کیا نہ کرتا مجبوراً اُسے رکشا کھینچکر پیٹ کا جہنم بھرنا پڑا، وہ جوان تھا، تندرست اور پھر گاؤں کا رہنے والا کچھ ہی دنوں میں اُسے رکشا کھینچنے کی عادت سی ہوگئی۔ یا یوں سمجھئے کہ غربت، مجبوری اور وقت کے تقاضوں نے مجبوراً سب کچھ سکھا دیا۔ اپنے پیٹ بھرنے کیلئے روزانہ پیسے کما لیتا اُسے زیادہ کمانے کی فکر نہ تھی۔ اس کا تھا ہی کون؟ کس کیلئے یہ کماتا؟ مالک کا بھاڑا اور اپنی خوراک کے لئے روزانہ پیدا کر لیتا تھا ———۔ مگر اس کا دل اس زندگی سے غیر مطمئن تھا، درد و کرب کی لہریں اُسکے دل میں اس طرح اُٹھتیں جیسے سمندر میں طوفان، وہ رہ رہ کر اس تکلیف دہ خیال کو دل سے نکال دینے کی اکثر کوشش کرتا ——— ناکام کوشش! کیونکہ بعض وقت بلکہ اکثر گھر، گاؤں اپنے بیگانے کی یاد اسکے دل میں بے طرح چٹکیاں لینے لگتیں، وہ ہمیشہ کھویا کھویا، چپ چپ سا رہتا۔ اوروں کی طرح اپنے درد دکھ کی کہانی لوگوں کو سنا کر وقتی طور پر اسے اپنا غم ہلکا کرنا بھی نہ آتا تھا، مزدور تھا مگر غیرت اسکی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، اس مفلسی کی حالت میں بھی اسکی خودداری اچھوتی تھی، انھیں تفکرات میں کبھی کبھی اسکی طبیعت بری طرح بگڑ جاتی اور اس وقت اسکو اپنی چھوٹی بہن پربھا یاد آ جاتی جو گھنٹوں اُس کا سر دابا کرتی تھی۔ اُٹھکر اپنے نازک ہاتھوں سے پانی پلاتی تھی ——— اس کا دل تڑپ کر رہ جاتا۔ وہ کسی دن تو کچھ کماتا بھی نہیں تھا، اس سے جب لوگ پوچھتے وہ کماتا کیوں نہیں؟ تو صاف جواب دیتا کس کیلئے کمائیں زیادہ کما کر کیا ہوگا؟ ——— بات آئی گئی ہوئی۔

——— آج بھی وہ ملول تھا، کوئی بات یاد آ گئی ہوگی۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا، یہ سوچ رہا تھا کہ روزانہ اور رکشا والوں کی طرح مجھے بھی چند مقررہ سواریاں ملجاتیں اور مہینے پر حساب ہوا کرتا تو اس طرح

گلیوں کوچوں میں مارے مارے پھرنے سے نجات ملجاتی، اس فکر میں ڈوبا غیرارادی طور پر رکشا لئے ہوئے گرل اسکول کے سامنے جا نکلا ایک نازک اور سریلی آواز آئی "اے رکشا! چورنگی تک چلوگے؟"
———کشور نے گھوم کر دیکھا، کچھ بڑھا اور جھجکا، جھجکا اور بڑھا———
ہاں حضور! رکشا حاضر ہے!"———آج تک اس نے کسی دوشیزہ کو رکشا پر نہیں بٹھایا تھا، اسے شرم معلوم ہوتی تھی کہ عورت کو بٹھا کر کھینچے، کتنی بار تو اس نے بہت سی لڑکیوں کو یوں ہی کہہ کر ٹال دیا تھا کہ رکشا خالی نہیں ہے!———لیکن آج پرمیلا کی آواز نے خلاف معمول نہ جانے کیوں اسے انکار نہ کرنے دیا۔ شاید یہ وجہ ہو کہ آج صبح سے اس نے ایک پیسہ بھی نہیں کمایا تھا———اُس نے گدی جھاڑ دی، دھوپ سے بچاؤ کیلئے چھتری اٹھا دی۔ ان انتظامات میں اُسے ایک حظ محسوس ہو رہا تھا، اس نے آج تک کسی خاتون سے اتنا گھُل ملکر باتیں بھی نہیں کھیں———

اس دن کے بعد وہ روزانہ وقت سے پہلے ہی اپنا رکشا لیئے گرلس اسکول کے بڑے پھاٹک پر کھڑا رہتا، جب پرمیلا رکشا پر چڑھ جاتی یہ اسے کبھی بہت تیز، کبھی بالکل آہستہ، کبھی ذرا دھیمی رفتار سے لیجاتا اور راہ میں کوئی نہ کوئی بات ضرور چھیڑتا، گفتگو کے مختلف پہلو نکالتا کچھ نہیں تو کم از کم یہی کہتا کہ سرکار آپ بڑی اچھی ہیں! زیادہ کما کر کیا ہوگا حضور، بس آپکو روز لیجاتا ہوں، دو تین سواری شام کو سینما او نیما کی ملجاتی ہیں۔ بس دال روٹی بھر پیٹ کھانے کو ہوجاتا ہے
———پرمیلا اسکی باتوں پر ہوں ہاں کر دیتی اور جب کچھ جواب نہ دیتی تو کشور گھوم کر تکتا پھر آپ ہی آپ ہنس کر کہنے لگتا "سرکار بہت پڑھتی ہیں، رکشا تک پر سرکار پڑھتی ہی رہتی ہیں!———"
"تمہارا کیا نام ہے رکشا والے" ایک روز پرمیلا نے یوں ہی پوچھ لیا۔ میرا نام؟———میرا نام کشور ہے سرکار"———"اچھا کشور تم رہتے کہاں ہو؟"———کشور سوچنے لگا کیا جواب دے۔ نہ اس کا گھر ہے نہ ٹھکانہ۔ وہ تو فٹ پاتھ ہی پر اپنا وقت بتاتا ہے———

———پرمیلا کو کشور کی عجیب و غریب، بھولی بھالی، بہکی اوٹ پٹانگ باتوں سے کچھ دلچسپی سی ہوگئی تھی، اس کا راستہ مزے سے کٹ جاتا تھا———آج شہر میں پہلی مرتبہ کسی نے اتنی مدت بعد کشور کو کشور کہہ کر پکارا تھا، کشور کا دل بھر آیا، اس کی آواز بیٹھنے لگی اسے اس وقت اپنا گھر بری طرح یاد آرہا تھا———وہ ویرانی اور تباہی!———پر اس نے چونک کر فوراً جواب دیا "رہیں گے کہاں سرکار، جہاں رات ہوگئی وہیں رہ گئے۔ کشور نے بڑی مشکل سے ان الفاظ کو ادا کیا۔ اسکی آواز تھرتھرا رہی تھی اور ہونٹ بری طرح کانپ رہے تھے، پرمیلا نے متعجب ہو کر پوچھا "کیوں کشور؟ کیا بات ہوئی؟ شاید تم———"
"نہیں کچھ نہیں کہاں کچھ ہوا سرکار———آہ! کبھی کبھی گھر بری طرح یاد آجاتا ہے۔ آج سرکار آپ نے میرا نام پوچھا———میں تو اپنا نام جیسے بھول ہی گیا تھا۔ میرے کان برسوں سے اپنا نام سننے کو ترس رہے تھے، دیوی جی! میں نے تو یقین کر لیا تھا کہ میرا نام رکشا والا ہوگیا ہے"———
"تو کشور! یہاں تمہارا کوئی بھی اپنا نہیں ہے کیا؟"
"آپ کیا غیر ہیں سرکار؟———آپ بھی تو اپنی ہی جیسی ہیں———جب سے میں آپ سے ملا ہوں میرا بہت کچھ دکھ درد ہلکا ہوگیا۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بہت دن بعد کوئی اپنا ملا ہے جس نے مجھے کشور کہہ کر پکارا———"
"ہوں"———پرمیلا خاموش ہوگئی، کشور لرز گیا اس سے کوئی گستاخی تو نہیں ہوگئی———ایسا ہی ایک دن ادھر اُدھر کی گپ کرتے ہوئے کہا "سرکار!" پھر وہ عجیب سراسیمگی کی حالت میں پرمیلا کو تکنے لگا، اس کے پاس الفاظ نہیں تھے پوچھنے کیلئے———لیکن پرمیلا کی مہربان نگاہوں نے بتلا دیا تھا کہ وہ خفا نہ ہوگی۔ جن الفاظ میں چاہے وہ باتیں کر سکتا ہے———
"ہاں! تم کیا کہنا چاہتے تھے کشور؟" پرمیلا نے جو اسکے دکھ درد کی کہانی سُن کر اس پر ترس کھانے لگی تھی پوچھا———
"حضور کا نام؟" کشور نے دبی زبان سے کہا، پرمیلا ہنس دی اور ہنستے ہوئے اس نے جواب دیا "میرا نام پوچھکر تم کیا کروگے؟"

کشور چپ ہوگیا، اُس نے سوچا سچ تو ہے، نام پوچھکر میں کیا کروں گا؟
—— وہ بہت پشیمان ہوا، خود پر لعنت ملامت کرنے لگا اُس سے
ایسی غلطیاں کیوں ہو جایا کرتی ہیں —— پرمیلا نے محسوس کیا
کشور اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہے، اس نے کہا ،، مجھے پرمیلا دیوی
کہتے ہیں، تمہیں یہ نام پسند ہے؟ ،، ——

،، بہت پسند ہے سرکار —— ہاں ایک بات بہت دنوں
سے سوچ رہا تھا، یاد نہیں پڑتا تھا —— کوٹھی سے آپ کسی کے
رکشا ہی پر تو آتی ہوں گی —— !؟ ،،

،، کوٹھی سے تو میں بابوجی کی کار میں آتی ہوں، لیکن پھر وہی
کار بابوجی کو لیکر ہائی کورٹ چلی جاتی ہے، اسی لئے اس طرف سے
ہمیں رکشا پر جانا ہوتا ہے —— اگر تم کل سویرے پو پھٹتے ہی
کوٹھی پر پہونچ جاؤ تو ہم بابوجی سے کہہ کر تمہیں کو ٹھیک کریں۔ اکثر
مجھے دیر ہو جایا کرتی ہے اور بابوجی کا کام حرج ہوتا ہے —— ،،
کشور نے خوش ہو کر کہا ،، سرکار آپ جس وقت بھی بلایئے
ہم ہر وقت حاضر ہیں، اگر وقت پر نہ آویں تو ایک پیسہ نہ دیجئے گا
سرکار! آپ بڑی دیالو ہیں —— ،،

،، کشور! تم بہت بڑھ گئے ہو ،، کشور کانپ گیا کہ پھر کوئی چوک
تو نہیں ہوئی اِس سے —— لیکن پرمیلا کھلکھلا کر ہنس پڑی جیسے
ہوا کے لطیف جھونکوں سے ،، کنول ،، اپنی پنکھڑیاں بکھرا دیں، اس نے
کہا ،، دیکھو کشور! ہم امیر ہیں، روپئے والے ہیں تو اس سے کیا ہوا،
تم غریب ہو لیکن میں سمجھتی ہوں کہ تم شریف ہو —— تم مجھے میرے
نام سے پکار سکتے ہو، یہ سرکار ورکار تو —— آخر تم نے میرا نام
پوچھا ہے کس لئے —— تم کو میرا نام لیکر پکارنا ہی ہوگا ——
زیادہ بڑے بڑے الفاظ سننے سے انسان مغرور سا ہو جاتا ہے۔
سمجھے؟ ،، ——

،، نہیں شریمتی جی! آخر غریب اور امیر میں کچھ فرق بھی تو ہونا
چاہیئے، میری ہمت نہیں پڑتی کہ میں اور آپ کا نام لے سکوں!!
اور نام تو صرف یونہی میں نے پوچھ لیا تھا —— ،،
،، تو تم گویا میری بات کاٹ رہے ہو؟ ،،

،، لیکن —— آپ —— ،،
،، نہیں —— آپ نہیں بلکہ تم ،، —— فرطِ مسرت سے کشور کے
ہونٹ کھلے کے کھلے رہ گئے اور اس نے اثبات میں اپنی گردن کو جنبش دی
یعنی وہ بھی پرمیلا کو ایسا ہی تصور کیا کرتا تھا کہ وہ امیر و غریب کی
کوئی تفریق نہیں کرنا چاہتی اور اس کی وقعت کشور کے دل میں اور
بڑھتی گئی —— پرمیلا ہی کی ضد کی بنا پر اگر یہ اس کا نام بھی لیتا تھا
تو بڑے احترام سے —— اسے پرمیلا کے یہاں دس روپے
ماہوار مقرر ہو گئے تھے۔ اب اسے مالک کا بھاڑا پورا کرنے کے لئے
صرف تھوڑی سی محنت اور کرنی پڑتی تھی —— لیکن کشور کا پہلا
زخم ابھی اچھی طرح بھرا بھی نہیں تھا کہ پرمیلا کے ان الفاظ نے اُسے
پھر سے ہرا کر دیا ،، سنتے ہو کشور! کل سے ہمیں اسکول نہیں آنا ہوگا ،،
،، کیوں؟ —— کیا بات ہوئی پرمیلا دیوی؟ ،، ——
،، کچھ نہیں —— کل سے ہمیں کالج کبھی نہیں آنا ہوگا ——
اچھا تم کل آؤ گے نا؟ ،، —— کشور ہکا بکا رہ گیا۔ اسکی سمجھ میں
کچھ نہ آیا، لیکن اس نے پرمیلا کے آخری الفاظ کو سنا۔ اور اپنے
جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ،، ہاں ہاں، ہم کل
کیوں نہیں آئیں گے، ہم ضرور آئیں گے، ہم تو آتے ہی ہیں، پرمیلا
دیوی ہم سے کسی روز دیر تو نہیں ہوئی، آپ ہم سے خفا کیوں ہو گئیں؟
—— اگر آپ ہی غصہ ہو جائیں تو پھر —— ،،
،، سنو! کل پھر تم آجانا ،،
،، کل کے بعد پھر پرمیلا دیوی؟ ،،
،، پھر کیا —— ؟ ،، ایسا معلوم ہوا جیسے کشور کے آنگن میں
چندرمان پھوٹ پڑا ہے، اس نے رات نہایت اضطراب میں کاٹی لسے
ہر چیز اداس، سونی سونی، اور روٹھی روٹھی سی معلوم ہوتی تھی سوچ
رہا تھا ،، آج پرمیلا دیوی اتنی اداس روئی روئی سی کیوں تھیں۔
—— ؟ —— پو پھٹتے ہی کشور چورنگی پہنچ گیا، دربان نے پرمیلا دیوی
کو جا کر خبر کی ،، آپ کا رکشا والا آگیا ہے۔ چھوٹی سرکار ،،
پرمیلا دیوی نے سنا اور خاموش ہو رہی، دل ہی دل میں اس نے کہا ہوگا
،، دربان بھی کیسا احمق ہے، میرا رکشا والا!! ،،

پرمیلا باہر نہیں آئی بلکہ اس کے پتا جی آئے اور انھوں نے پوچھا، "تمہارا کتنا حساب ہوا رکشا والا؟" ——

"خیر تو ہے سرکار، ہم سے کوئی غلطی تو نہیں ہوئی، پھر ایسا کیوں؟" —— پرمیلا کے پتا نے جواب دیا کہ "نہیں کشورا! پرمیلا نے کالج چھوڑ دیا ہے، تم اپنا حساب لے لو۔" —— کشور نے کچھ جواب نہیں دیا، سکتہ میں رہ گیا، اس کا دماغ بری طرح گھوم رہا تھا اس نے بڑی ہمت سے کام لیکر پوچھا "کیوں سرکار! پرمیلا دیوی اب نہیں پڑھیں گی؟" —— سورلیش بابو نے ہنستے ہوئے کہا۔ "نہیں کشورا! پرمیلا کا بیاہ ہے نا، تمہیں بھی کچھ کام کاج کرنے کو کل سے آنا ہوگا، مطمئن رہو تمہیں پوری مزدوری ملجایا کرے گی۔" ——

کشور نے ایک کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے جواب دیا "بڑی اچھی بات ہوئی! بڑی اچھی بات!! ہم بہت خوش ہیں سرکار —— کل سے ہم ضرور آئیں گے۔" —— !!!

—— کشور —— نڈھال اس گھوڑے کی مانند جسے چابک سوار نے بے قصور سینکڑوں کوڑے لگا کر اس کے جسم کو گھائل کر دیا ہو، ڈگمگاتا ہوا چلا، اس کا دماغ ان باتوں کی آماج گاہ بنا ہوا تھا جو پرمیلا نے اس سے کہی تھیں "ہم امیر ہیں، روپئے والے ہیں تو اس سے کیا ہوا، تم کو مجھے پرمیلا ہی کہنا ہوگا۔" —— وہ سوچ رہا تھا کہ اب آسے کشور کہہ کر کون پکارے گا اور کس سے وہ باتیں کرے گا، اور کس کو پرمیلا دیوی کہے گا۔

کشور انہیں خیالوں سے الجھتا ہوا بڑھتا گیا، اسکے رکشا پر آج پرمیلا دیوی نہیں تھی، سب سے پہلے صبح ہوتے ہی اسکے رکشا پر پرمیلا رہتی تھی، یہ روز اپنی دیوی کا درشن کیا کرتا تھا، آج اس کا رکشا خالی تھا، جیسے اس کے کلیجے پر سانپ لوٹ رہا ہو —— وہ گرلس اسکول کی طرف آنکلا، بالکل غیر ارادی طور پر —— اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے بی، ان، آر، ٹریننگ کالج کا بڑا پھاٹک ایک مہیب دیو ہے اور اسے پکڑنے کیلئے بڑھا آرہا ہے —— وہ فوراً پلٹا —— اس نے کہا "جب پرمیلا ہی نہیں چڑھیں گی تو پھر کس کا منہ ہے میرے رکشا پر چڑھنے کا، اس نے رکشا لیجا کر مالک کے حوالہ کر دیا —— ایک مرتبہ

وہ پرمیلا کو دیکھنا چاہتا تھا، وہ سوچتا تھا پرمیلا نے اسے بتلا کیوں نہیں دیا کہ اس کی شادی ہونیوالی ہے، اس میں اس کا کیا بگڑ جاتا —— پھر یہ بھی سوچتا کہ آخر وہ بتلاتی ہی کیوں —— ؟ میں ہوتا ہی کون ہوں آ! ؟ —— کشور کا دل بھر آیا، خیال میں کھویا ہوا، وہ پرمیلا کی کوٹھی پر پہنچا سورلیش بابو نے کہا "کشورا! آج یہ بیٹھک صاف کر دو اور کل پرمیلا کا کمرہ صاف کر دینا۔" —— پرمیلا کا نام سن کر اور آخری بار اپنی مقدس دیوی کی خدمت کرنے کا موقع پا کر کشور کے پژمردہ آنکھوں میں ایک ہلکی سی مسرت کی چمک جاگ اٹھی —— اس نے بڑی تندہی سے کام کیا اور کام ختم کرنے کے بعد بازار آیا۔ پہلے تو اسے پیسوں کی بالکل ضرورت نہیں رہتی تھی لیکن اب تو نہ معلوم کیوں اسے صرف پیسوں کے حاصل کرنے ہی کی فکر رہتی۔ سوائے پیسوں کے اسے اور کچھ نہیں بھاتا، اس نے بوجھ ڈھونا شروع کر دیا۔ وہ مزدوری کرتا اور صرف تھوڑا بہت روکھا پھیکا کھا کر تمام پیسوں کو بچا کر رکھ لیتا۔ —— لوگ اسے دیکھتے اور تعجب کرتے تھے کہ شاید اس کا دماغی توازن بگڑ گیا ہے۔ اتنا اچھا جوان گھل کر کانٹا ہو گیا، اس پر کونسی مصیبت آن پڑی ہے —— ہر صبح کشور سورلیش بابو کے یہاں جاتا اور کام ختم کرنے کے بعد مزدوری کرنے کیلئے بازار چلا جاتا، ایک روز سورلیش بابو نے کہا "کشور! سنتے ہو، پرسوں پرمیلا کی بارات آنیوالی ہے، تم سویرے ہی سے چلے آنا، باراتیوں کا سامان وغیرہ تمہیں کو اتارنا ہوگا۔"

"بارات! پرمیلا دیوی کی بارات!! —— پرسوں ہیں ؟ —— اُف بھگوان —— !! ؟"

کشور پھر بازار چلا آیا، پاگلوں کی طرح یہ ہر آنیوالے جانیوالے سے پوچھتا "بوجھا ہے سرکار؟ سستا ہی پہنچا دوں گا"، لوگ اس کا منہ تکتے ہوئے بڑھ جاتے اور وہ مایوس ہو جاتا —— سبھوں کو یقین سا ہو چلا تھا کہ کشور پاگل ہو گیا ہے۔ بعض لوگ جو اس کے گزشتہ دُکھ درد کی کہانی جانتے تھے دوسروں سے دوہراتے اور ہمدردانہ انداز میں کہتے۔ "جس پر اتنی مصیبتیں پڑی ہوں جو اتنے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتا ہو، پڑھا لکھا ہو، جس پر اچانک مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہو وہ

پاگل نہ ہوگا تو کیا ہوگا، جبتک بدن میں خوب کس بل رہا رکشا کھینچا، لیکن اتنی کڑی دھوپ میں تپتی ہوئی سڑک پر رکشا کھینچنا کوئی معمولی بات نہیں ہے، دماغ گرم تو یقینی ہوگا ——— !” کشور پریشان حال آبادی سے دور ایک ویران مقام پر چلا گیا، کمر سے ایک میلا کچیلا جالی دار بٹوا نکالا، پیسوں، دھیلوں، اکنیوں سبھوں کو گننا شروع کیا “تیرہ روپے ساڑھے چار آنے !” ایک دھندلی سی خوشی اُسکے چہرہ کو مس کر گئی۔ وہ پھر بازار آیا، ایک سنار کی دکان پر پہنچا، سب پیسوں کو جو اسکی زندگی بھر کی کائنات تھی بکھیر دیا اور کہا “بابو جی ! اسے گن لیجئے اور مجھے ایک بڑھیا سونے کی انگوٹھی دیجئے اگر کچھ گھٹے گا تو ہم کما کر آپ کا چکا دیں گے بابو جی، ہم یہیں پر تو رہتے ہیں، آپ مطمئن رہئے سرکار ——— !” کشور کی سراسیمگی، اسکی اتنی شستہ زبان اور یہ زبوں حالی سُنار کو متعجب کرنے کیلئے بہت کافی تھی، بہرحال اُس نے ایک انگوٹھی نکال کر دیدی۔ کشور نے انگوٹھی کو بڑی احتیاط سے کمر میں بٹوے کے اندر رکھا ——— صبح ہوتے ہی پرمیلا کی کوٹھی پہنچا۔ پرمیلا ابھی ابھی سو کر اٹھی تھی، اس کا چہرہ خزاں کے سفید گلاب کی طرح اترا ہوا تھا ——— کشور کی باچھیں کھل گئیں ——— پرمیلا نے بھی کشور کو دیکھا اور ٹھٹھک گئی، کشور نے پژمردہ لب و لہجہ میں کہا ———

“ابھی بہت سویرا ہے نا پرمیلا دیوی؟ بابو جی نے سویرے ہی بلایا تھا، آج تمام کمروں کو صاف کرنا ہے” پرمیلا کشور کو تکتی رہی، چپ چپ سی پھر اس نے کہا، “تم اب رکشا نہیں چلاتے کشور؟” کشور خاموش رہا، دو موٹے موٹے آنسو اسکی پلکوں میں بھر کے اور ڈھلک گئے، نہ معلوم کیوں پرمیلا کی بھی پلکیں کچھ بوجھل تھیں۔ کشور نے کہا پرمیلا دیوی اگر ——— پھر یہ ہو گیا، پرمیلا اسکے بالکل قریب ہو گئی، ہمدردانہ و سرگوشیانہ انداز میں اُس نے پوچھا “کیا ہے کشور؟ تم کہنا کیا چاہتے تھے؟ ———”

پرمیلا دیوی تم سچ مچ کی دیوی ہو، ایک بات جو مان لو اپنے غریب اور پرانے خدمت گزار کی ——— !”

“بولتے کیوں نہیں کشور؟ آخر مطلب کیا ہے تمہارا؟” ———

“غریب کا آپ سے کیا مطلب دیوی جی؟ صرف یہ نشانی ——— اگر قبول کر لیں اسے تو میں سمجھوں گا ——— نہیں میں بہت ہی خوش ہوں گا سرکار” ——— پرمیلا کشور کو اچھی طرح سمجھانا چاہتی تھی

لیکن وہ جذبات پر قابو نہ پا سکی۔ اس نے صرف اتنا کہا “کشور! یا تم نے روپیہ فضول برباد کیا ——— تم غریب ہو اور غریب کی نشانی ہی کیا؟ غریب تو خوش رہنے کیلئے نہیں پیدا کیا گیا ——— اور پھر آجکل تو تم رکشا بھی نہیں کھینچتے” ——— یہ کہتے کہتے وہ بہت زور زور سے سسکیاں لیتی ہوئی اپنے کمرہ میں چلی آئی، اتنے میں سورلشیں بابو بھی آ گئے۔ انہوں نے کشور کو دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا “واہ کشور! خوب تم آ گئے! جاؤ پرمیلا اپنے کمرہ میں ہے، آج اسی کا کمرہ تمہیں صاف کرنا ہے” ———

کشور کمرہ میں چلا تو آیا لیکن ایک بے جان، بے حس مجسمہ کی مانند کھڑا رہا وہ انگوٹھی اپنی مٹھی میں بھینچے ہوئے تھا، پرمیلا نے مڑ کر اس پر ایک نگاہ ڈالی اور بولی “ہاں تو تم میرا کمرہ صاف کرنے آئے ہو نا؟ اچھا دیکھو یہ بستر باہر کر دو اور یہ گھڑی میز کے اندر رکھ دو۔ اور ہاں دیکھو اسے مت چھونا یہ بجلی کا تار ہے، لیگ کرتا ہے، بابو جی نے کہا ہے مستری بلوا کر اسے ٹھیک کرانا ہوگا!” ——— پرمیلا چلی گئی، کشور جلدی جلدی کمرہ صاف کرنے لگا، وہ کمرہ صاف کرتا تھا اور سوچتا تھا “ہم امیر ہوئے، روپے والے ہوئے تو کیا ہوا؟ تمہیں مجھے پرمیلا کہنا ہی ہوگا” پھر اس کے دماغ نے ایک پلٹا کھایا اور وہ سوچنے لگا “تم غریب ہو اور غریب کی نشانی ہی کیا؟ صرف یہ انگوٹھی!” اس کے دماغ نے ایک پلٹا اور کھایا “اسے مت چھونا یہ بجلی کا تار ہے” ——— کشور پاگلوں کی طرح زور سے ہنسا اور جھپٹ کر اس نے تار کو پکڑ لیا ایک ہلکی نحیف چیخ کمرہ میں گونج کر رہ گئی۔

——— پرمیلا کے پائیں باغ میں ایک حقیر بیل ناشپاتی کے درخت کا سہارا پا کر بہت دور تک چڑھ گئی تھی ——— شدنی! ہوا کے ایک تیز جھٹکے نے آج اسے پھر زمین پر گرا دیا ——— سامنے سے ایک بکری آئی اور اسے چر گئی ———

کشور کی جو کہانی نباتاتی حرفوں میں لکھی نظر آتی تھی وہ بھی اسکی زندگی کے ساتھ ختم ہو گئی۔

گالزوردی

عجیب بات

چند روز ہوئے، اپنے ایک مغربی حصہ کے قیام کے دوران میں، کیونکہ میں کبھی آجتک اس طرف نہ آیا تھا، میں سیر کے لئے نکل گیا ——— مارچ کی ٹھنڈی صبح تھی!

میں ایک ایسے خلجان میں تھا جو اکثر ادیبوں کو ہوا کرتا ہے خالی الذہن، خود اعتمادی مفقود، ہزاروں قسم کی الجھنیں گھیرے ہوئے کتنی تکلیف دہ ہے قلم کے سہارے جینے والوں کی زندگی بھی۔ ایک جہد و ایک کوشش اور بقول میرے ایک دوست کے ایک مردانہ وار کوشش!

ہاں تو میں اس وقت یہی سوچ رہا تھا۔ ہوا کی نرم لہریں رگ و پے میں ایک زندگی پھونک رہی تھیں، ایک چمکدار سورج نیلگوں آسمان کی سطح پر تیر رہا تھا مگر میرا ذہن ابھی تک اسی طرح بیکار تھا روشنی کی ایک شعاع بھی میرے دماغ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ نہ معلوم وہ ہلکے رنگ کے تیرتے ہوئے قرمزی سائے جو دماغوں کو کام کرنے پر ابھارتے ہیں اس وقت کہاں غائب ہو گئے تھے۔ نہ معلوم وہ غیر مرئی قوتیں جو روح میں احساس اور گرمی پیدا کر دیتی ہیں اس وقت کہاں سو گئی تھیں اور میں اُکتا کر اپنے پیشہ کو گالیاں دینے لگا۔

میری نگاہیں پہاڑی سلسلہ کے نشیب و فراز میں بھٹک رہی تھیں، یہ جنگل، یہ وادیاں، یہ حسین چٹانیں اور یہ ایک قوس و قزح کا سا حلقہ مجھے بے چین کر رہا تھا کہ میں اس حسن، اس خوبصورتی اور اس دلکشی کو اپنے الفاظ میں محصور نہیں کر سکتا۔ اونچی نیچی بل کھاتی ہوئی روشوں کو تراش کر ہموار کر دیا گیا تھا اور ان کے پیچھے ہر چیز نہایت صاف نظر آ رہی تھی۔ یکایک میری نگاہوں کے سامنے کچھ بلبلے سے ناچنے لگے۔ کچھ سیاہ و سپید چیزیں ہوا میں متحرک معلوم ہوئیں، ایک، دو تین، کبوتروں کا ایک جھنڈ ہوا میں اڑتا ہوا جا رہا تھا، حسین پرندے اپنے طول طویل سفر پر گنگناتے ہوئے روانہ ہو رہے تھے اور تھوڑی ہی دیر میں وادیوں اور جنگلوں کو پار کر کے ان کے پیچھے غائب ہو گئے لیکن مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اپنے پیچھے کچھ چھوڑ گئے ہیں۔

خیالات کروٹیں سی لگے تھے، مایوسی میں دبی ہوئی ایک امید پھر اُبھر آئی تھی اور اس وقت یہ جی چاہا کہ اپنے آپ کو انہی وادیوں کی رنگینیوں کے حوالہ کر دوں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دوسری پگڈنڈی کے موڑ پر سے گرجا کی گھنٹیوں کی جھوجھری آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کوئی تین سو قدم کے فاصلہ پر ایک بستی نظر آ رہی تھی۔ آدمیوں کے گروہ خوبصورت لباس پہنے ہوئے اور عورتیں نرم و نازک لباسوں میں ملبوس آپس میں باتیں کر رہے تھے اور گرجا کے مربع صحن کے اوپر ایک چمکدار کلس مسکرا رہا تھا!

"کیا بات ہے" میں نے سوچا۔ آج اتوار بھی نہیں، کسی امیر زادے کی سالگرہ بھی نہیں معلوم ہوتی اور کسی پیر کا عرس بھی نہیں اور عرس ان علاقوں میں اس طرح منائے بھی نہیں جاتے، پھر کیا بات ہے، یقیناً کسی کی شادی ہے۔ اور میں دیکھنے کیلئے اس منتظر گروہ میں سے گزرتا اور الجھتا ہوا اندر تک پہنچ گیا۔ وہاں بھی لوگوں کی بھیڑ بھاڑ تھی اور سب دروازہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بھڑوں کے چھتہ کی طرح بھن بھن ہو رہی تھی۔ گرجا اسی طرح جس طرح وہ آج سے برسوں پہلے کھڑا تھا خاموش اور ساکت تھا، اس کی دیواریں اور بھاری بھاری پتھر دیہاتی عبادت گذاروں کا تماشا دیکھ رہے تھے لیکن اتنی بات ضرور تھی کہ آج یہاں معمولی سے زیادہ رونق تھی اور ہوا میں لوگوں کے کپڑوں کی خوشبوئیں اڑ رہی تھیں۔

گھنٹیاں جو ابتک ایک مترنم آواز میں آہستہ آہستہ بج رہی تھیں

اور ایک خاص قسم کا کیف و سرور پیدا کر رہی تھیں اب زور زور سے
بجنے لگیں۔ ان کی اس وقت کی بے ہنگم چیخ سے ایسا معلوم ہوتا تھا
جیسے دلہن بہت قریب آگئی ہے اور بس یہاں پہونچنے ہی والی ہے میری
نگاہوں کے سامنے ایک نوجوان کھڑا تھا جو ابھی ابھی لڑکپن کی حدوں
سے نکل رہا تھا۔ ان کے گرد لوگوں کے حلقہ دستانے چڑھے ہوئے
ہاتھوں اور اس کے کھیلتے ہوئے چہرے پر ایک خاص قسم کی ہنسی سے
معلوم ہو رہا تھا کہ یہی دولہا ہے۔ مجھے وہ اس وقت نہایت بھلا
معلوم رہا تھا۔ وہی معمولی دیہاتی تراش خراش، فطرت میں ایک
بیباکی اور آزادی اور نگاہوں میں ایک امنگ لیکن کوئی خاص طور
پر اس کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ سب لوگ دلہن کا انتظار
کر رہے تھے۔ اور سب لوگوں کے ساتھ مجھے بھی بے چینی ہونے لگی۔
کیسی ہوگی وہ؟ ایک معمولی قسم کی دیہاتی لڑکی۔ بھرے
بھرے گلے، کھردرا سا نقاب، بھورا سا رنگ اور خرگوش کی سی آنکھیں
یا پھر کچھ .... کچھ اس لڑکی جیسی جسے میں نے ایک مرتبہ دیلز
میں دیکھا تھا اور اس کے بعد سے آج تک اس جیسی نظر سے نہ گذری
میں نے ذرا آگے کو جھک کر ایک عورت سے جس کا چہرہ سیب کی طرح
گول اور پکا ہوا تھا پوچھا، "کیا آپ بتا سکتی ہیں ان میں دلہن
کونسی ہے؟"

اس نے مجھے اپنی گول گول، بھوری اور اجنبی نگاہوں سے
گھورتے ہوئے جواب دیا "کیوں! تم نہیں جانتے۔ یہ ناوا ہے، اس
علاقہ میں سب سے خوبصورت لڑکی"، اور پھر اس نے اپنا انگوٹھا
نچاتے ہوئے دولہا کی طرف اشارہ کر کے جسے سب نے نظر انداز کر رکھا
تھا کہا "بڑا خوش قسمت ہے یہ جو اسے ایسی حسین لڑکی اور اچھی
لڑکی ملی"، مگر اس کی اس تشریح سے میری کچھ تسلی نہ ہوئی۔

ایک شور، ایک حرکت، ایک بے چینی!

اور لوگوں کی طرح میں بھی بلا تکلف گھوم گیا۔ وہ ایک پشت سے
خانہ بدوش نما آدمی کے سہارے سہارے اپنے بہترین دیہاتی لباس
میں آرہی تھی۔

میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ اس مٹیالے گرجا کے صحن اور
ان سیاہ پوش آدمیوں کے درمیان وہ ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے
کوئی سورج کی کرن ناچ رہی ہو۔ میں نے اتنا مسرت انگیز سہانا
اور دلکش چہرہ آج تک نہیں دیکھا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اسکے لبوں پر
کھیل رہی تھی، ایک شوخی اس کی نگاہوں میں رقص کر رہی تھی اور
وہ اپنے ماحول کی دلچسپیوں میں جذب ہوئی جا رہی تھی، اس کے
سرکش اور سنہرے بال موٹے سے نقاب میں مچل رہے تھے، اس کی
پتلیاں مست بھونروں کی طرح رقصاں تھیں۔ اسے دیکھ کر ایسا محسوس
ہوتا تھا جیسے کسی نوعمر سیب کے پھولوں پر سورج کی کرنیں ناچ رہی ہیں۔
مچل رہی ہیں۔ اس کے چہرے پر ایک خاص چمک تھی جو انسان کی نیک
فطرت کی انتہائیوں سے ابھرتی ہیں۔ مجھے اس کا چہرہ دیکھ کر اور یہ
معلوم کر کے کہ وہ اچھے ہاتھوں میں جا رہی ہے ایک سکون سا ہو گیا۔

گرجا کے صحن میں نرگس کے پھول اُگے ہوئے تھے جو اس
لڑکی کی شادی پر عین موزوں تحفہ تھا۔ جب وہ باہر نکلتی تو ان پھولوں
میں لدی ہوئی تی اور ایک ایسا تکلیف دہ اعتراف جس کے بغیر
معصوم سے معصوم روح بھی خوشی کی حدوں کو نہیں پہنچ سکتی
اسکے چہرے سے نمایاں تھا۔ دنیا میں ایسی چیزیں بھی ہیں جنہیں
دیکھ کر آدمی ایک گونہ اطمینان محسوس کرتا ہے، سورج کی روشنی
، پھول، کھیلتے ہوئے تندرست بچے، خوش الحان پرندے، بادل
پہاڑ، نیلگوں آسمان، رقص اور نوجوان لڑکی کا چہرہ اور اس وقت
مجھے بھی یہی احساس ہوا کہ سب لوگ اسکے چہرے کو دیکھ کر ایک گونہ
خوشی محسوس کر رہے تھے!

وہ جا چکی تھی اور ایک خاموشی، سکون اور تنہائی اپنے پیچھے
چھوڑ گئی تھی۔ میرے آگے آگے ایک لنگڑا بوڑھا اپنے رخساروں پر
اگی ہوئی گھنی ڈاڑھی میں انگلیاں پھیرتا ہوا "مسکراتی ہوئی نگاہوں
سے اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ میرے چہرے پر بھی ایک ہلکی سی
مسکراہٹ دیکھ کر اس نے کہا۔ "کیا ستم ظریفی ہے! جب ایسی لڑکیاں
بھی شادی کے بعد چلی جاتی ہیں تو روح لرز جاتی ہے"، میرے سر ہلانے پر
اس نے پھر کہا "یہ سورج کی نرم اور بے باک کرنیں اب یہاں کبھی
نہیں آئیں گی، جھوٹ نہیں، اب یہاں ایسی لڑکی نہیں مل سکتی!!"

میں گفتگو کیلئے کوئی موضوع تلاش کرنا چاہتا تھا، میں نے کہا،
"کیا وہ اس کا باپ تھا"
اس نے تیز تیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے زور سے گردن جھٹکی، نہ اس کی ماں ہے نہ باپ، یہاں مارا کا کیا کہتے ہیں اُسے چچا رہتا ہے، ماں باپ نہیں اسکے، اس نے فقرہ کو دہرایا۔ اسکی آواز کے ٹھہراؤ میں ایک تکلیف کا احساس تھا، ایک کھرکھراپن جیسے وہ کچھ جانتا ہے اور بتانا نہیں چاہتا۔

کیونکہ اب انتظار کے قابل کوئی چیز نہیں رہی تھی اس لئے میں اوپر کی پگڈنڈی پر ایک چھوٹی سی سرائے میں چلا گیا اور روٹی اور پنیر لانے کیلئے کہا۔ اندر کے کمروں میں بہت سے آدمی کھانے پینے اور شور کرنے میں مصروف تھے اس لئے میں ایک اجنبی کی حیثیت سے باہر برآمدہ ہی میں بیٹھ گیا اور وہیں مارچ کے سورج کی نرم شعاعوں میں اپنا معمولی سا ناشتہ ختم کیا، پیسے دیئے اور چل دیا۔ میرے سامنے تین چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کے نشیب و فراز کو دیکھ کر میں یوں ہی بے جانے بوجھے ایک پر ہو لیا، در اصل یہاں تو کی تفریح یہی ہے کہ بلا جانے بوجھے کہیں سے روانہ ہو گئے اور کہیں جا نکلے۔ اس پگڈنڈی پر کل دو چیزیں نظر آئیں ایک جھونپڑی اناؤ اور ایک کھیت چڑھان پر اور تمام راستہ میں کچھ نہ تھا۔ بہار ابھی ان علاقوں میں اچھی طرح اجاگر نہ ہوئی تھی۔ کہیں کہیں درختوں پر کلیاں نظر آجاتی تھیں اور کبھی کبھی سورج کی روشنی میں ہوا کے کندھوں پر برف کے ٹکڑے اڑتے ہوئے دکھائی دے جاتے تھے۔ دوسری طرف دیوار کے ایک کنج کے پاس پگڈنڈی ایک مکان کے صحن میں ڈوبتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی جہاں تین چھکڑے کھڑے تھے، جن کا رخ آسمان کی طرف تھا۔ پگڈنڈی پر نرگس کے پھول بکھرے پڑے تھے اور مکان سے شور بلند ہو رہا تھا۔ لوگوں کی آرجار اور بھنبھناہٹ سے مجھے اچانک محسوس ہوا کہ میں اتفاق سے دلہن کے مکان پر پہونچ گیا ہوں۔

میں نے اپنی حیرانی کو دباتے ہوئے خشک پتھریلی زمین، کبوتروں، مرغیوں اور کتوں کے شور اور پرانے ڈھیر نما مکان کی بوالعجبی پر ایک نظر ڈالی اور ایک دائیں ہاتھ کی پگڈنڈی پر جو ایک ندی کے پاس سے ہو کر گزرتی تھی مڑ گیا۔ میرے دائیں ہاتھ پر ایک بہت بڑا اپڑا درخت کھڑا تھا اور بائیں ہاتھ پر ایک اجاڑ سا میدان پڑا تھا جس میں بہت سے درخت اُگے ہوئے تھے پگڈنڈی نیچے ایک مکان کے دروازہ پر جا کر ختم ہو جاتی تھی جہاں پتھروں کی ایک چٹان سی بنی ہوئی تھی۔ کٹے ہوئے کھیت خزاں کی یاد دلا رہے تھے اور کھیتوں کی باڑیں بے ترتیبی کے ساتھ اکھڑی پڑی تھیں۔ لہو کی آمیزش لئے ہوئے چھوٹے چھوٹے شرارے اور نیلا دھواں زرد زرد نیم وا کلیاں، سورج کی کرنیں اور کچھ اڑتے ہوئے برف کے ٹکڑے ہوا میں ایک عجیب قسم کی رنگت پھیلا رہے تھے میں وہاں پہونچکر رکا اور سوچنے لگا آیا مجھے نیچے جانا چاہئے یا نہیں؟

آخر کار میں نے ارادہ کر لیا کہ ضرور نیچے جاؤں گا اور اس خیال سے دروازہ کو دھکیلنا شروع کیا۔ اچانک میری نظر ایک عورت پر پڑی جو درخت سے ورے دیوار کے سایہ میں ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی تھی اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں دبا رکھا تھا، اسکی آنکھیں بند تھیں اور وہ اپنے بدن کو آگے پیچھے جھلا رہی تھی اس نے ابھی مجھے نہیں دیکھا تھا، نیلی سرج کا لباس اس کے بدن پر تھا، ہیٹ اسکے قریب زمین پر پڑا ہوا تھا اور اس کے سیاہ بال رخساروں پر پھیلے ہوئے تھے۔ وہ چہرہ جس پر کرنیں سی منڈلا رہی تھیں ایک دم بھیانک اور حماقت انگیز معلوم ہونے لگا۔ جو چہرہ کبھی حسین رہ چکا تھا اب زندگی اور تیز احساسات کے ہاتھوں کھردرا اور متورم ہو گیا تھا۔ اب اسکی طرف دیکھنے سے بھی تکلیف ہوتی تھی۔ اس کا لباس، اس کا ہیٹ اور جس طریقہ پر اسکے بال بنے ہوئے تھے ان میں شہری تہذیب کی جھلک تھی۔ اس میں ایک ایسی بے نام سی چیز جھلک رہی تھی جو صرف ان عورتوں میں ہوتی ہے جن کا کام مردوں کو لبھاتا ہے، لیکن اتنے پر بھی اسکی نظروں میں ایک حیرانی تھی جیسے وہ شہر میں بہت کم رہی ہو۔

بے حس ماحول، ایک عورت، آزردہ خاطر اور اپنی پریشانیوں پر قابو پانے کے ناقابل۔ کون ہے جو اس منظر کو دیکھ کر متاثر نہ ہوگا

میں وہیں ٹھہر گیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کیا کروں۔ وہ اسی طرح اپنے بدن کو آگے پیچھے جھلا رہی تھی۔ اور اس کے لبوں سے ایک مدھم سی کراہنے کی آواز نکل رہی تھی۔ پھر اچانک اس کا سر اسکی گود میں جھک گیا اور اسکے بازو بے جان ہو کر اِدھر اُدھر جا پڑے جیسے وہ بیہوش ہو گئی ہے اسے اس حالت میں چھوڑ کر کیونکر جایا جا سکتا ہے؟ لیکن اس سے کہا بھی کیا جائے۔ کوئی جسمانی بیماری بھی معلوم نہیں ہوتی؟

میں اسی تذبذب میں کھڑا ہوا اُسے دیکھتا رہا۔ یہ کونہ ہولسے محفوظ تھا۔ سورج گرم ہو چلا تھا اور ہواؤں پر ایک جمود سا طاری ہو گیا تھا۔ کامل تین منٹ تک اس نے انگلی تک نہ ہلائی یہاں تک کہ میں سوچنے لگا کہیں وہ بیہوش تو نہیں ہو گئی؟ میں اس کے قریب گیا اسکے بدن سے گرم غازہ آلود بھبکا آ رہا تھا، چہرہ پر ہلکا ہلکا ورم تھا اور ٹوٹی ہوئی سانسوں میں غنودگی اور مدہوشی تھی۔

میں نے ہمت کر کے اسکے بازوؤں کو چھوا، اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ ایک حسین زمانے کی یادگار صرف آنکھیں اس کے پاس رہ گئی تھیں جو کبھی بہت حسین ہوں گی۔ اب خون میں بجھی ہوئیں اجنبی اور حیران قدرے جری اور بیباک جو ایک خاص طبقہ کی عورتوں کی خصوصیت ہے۔ وہ بولی نہیں میں نے ہچکچاتے ہوئے پورٹ کا ایک جام جو سفر کے دوران میں ہر وقت میرے ساتھ رہتا تھا نکالا اور اس سے کہا۔

"معاف کیجئے.... آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں.... اگر آپ مناسب سمجھیں تو یہ" اور میں نے جام اسکی طرف بڑھا دیا کچھ دیر تک وہ ایک خلا میں گھورتی رہی اور پھر میرے ہاتھ سے جام لیتے ہوئے کہا "بڑی تکلیف کی آپ نے، میں بھی اسکی ضرورت محسوس کر رہی تھیں" اور وہ جام ہونٹوں سے لگا کر اس کا آخری قطرہ تک پی گئی اور جام واپس کرتے وقت ایک نامانوس مسکراہٹ اسکے ہونٹوں پر آ گئی۔

"غالباً آپ مجھے یہاں بیٹھا ہوا دیکھ کر ہنسے ہوں گے"

"جی نہیں میرا خیال تھا آپ بیمار ہیں"

ایک کھوکھلی ہنسی اسکے گلے میں گونجنے لگی۔

"مجھے جانا چاہئے تھا، کیوں؟ لیکن اسکی بھی ایک وجہ ہے۔ وہی پرانی جگہ، کئی سال کے ایک طویل سلسلہ کے بعد"

اس نے اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اٹھا کر میری طرف دیکھا جنہیں شراب نے اور بھی جگا دیا تھا۔ غالباً وہ یقین کرنا چاہتی تھی کہ آیا اس نے مجھے پہلے کبھی دیکھا ہے یا نہیں یا پھر یہ کہ میں کس قماش کا آدمی ہوں اور پھر اُس نے کہا

"میں یہیں پیدا ہوئی تھی کیا تم بھی یہیں کے رہنے والے ہو؟"

"نہیں میں یہاں کا رہنے والا نہیں" میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

وہ پھر ہنسی اور ایک لمحہ خاموش رہ کر بولی

"میں ایک شادی میں آئی تھی ——— پیدائش کے بعد سے میں نے آج اسے پہلی دفعہ دیکھا ہے"

میں ایک اندرونی جذبہ کے ماتحت خاموش رہا۔

"میں اپنی لڑکی کی شادی میں آئی تھی لیکن کوئی مجھے جانتا نہیں، کوئی بھی نہیں جانتا"

میں وہیں دیوار کے سائے تلے اسکے مقابل ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور ان الفاظ پر ایک گہری دلچسپی کے ساتھ اسکی طرف دیکھنے لگا۔ یہ — اکھڑ، آوارہ، غازہ آلود شہری عورت اس نرم و نازک سورج کی کرن جیسی لڑکی کی ماں تھی جس کی ابھی ابھی شادی ہوئی تھی؟

میری خاموشی پر وہ پھر مسکرائی۔

"لڑکی کیا میرا بھائی تک مجھے نہیں پہچانتا، اور پھر وہ جان بھی کیسے سکتی ہے جب وہ بچہ ہی تھی کہ میں اس سے الگ ہو گئی تھی اور اسکے بعد سے آج تک اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ اسوقت وہ محض ایک جاندار مضحکہ خیز سا گوشت کا لوتھڑا تھی" اور میرے چہرے پر نظر ڈال کر وہ پھر ایک خلا میں گھورنے لگی جیسے اپنے گذرے ہوئے اوقات کا جائزہ لے رہی ہو۔

"اسے وجود میں لانے کیلئے ہم غالباً یہیں ہنس بول رہے تھے ہاں بالکل اسی جگہ تھے ایک گرمیوں کی رات میں۔ اس رات میرے سر پر ایک جنوں سوار تھا، ایک سودا" اور پھر اس نے میرے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے کہا "ہر لڑکی کی تقدیر یہی ہے، کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی وقت! اب میری عمر پینتیس سال کے لگ بھگ ہے اب تو میں اپنی آخری منزل سے بہت قریب آ گئی ہوں اور اب اس سے زیادہ توقع

بھی کیا کہا جا سکتی ہے؟ میری زندگی کا مقولہ" خوش باش رہو" رہا ہے
مگر اب تو میں اپنے حصہ کا سب کچھ ختم کر چکی ہوں اور اس کا باپ ....
اس کا باپ بھی مر چکا ہے!"

"تمہارا مطلب ہے کہ محض اس لڑکی کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا"

"چاہو تو یوں بھی کہہ سکتے ہو۔ اس لڑکی نے مجھے اور اسے ایک دوسرے سے دور کر دیا۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں سپرد عوئی دائر کر دوں۔ وہ روپیہ ادا نہیں کر سکتا تھا اس لئے وہ چلا گیا۔ اور دو سال بعد جنگ بوئر میں مارا گیا اور میں، میں بھی! لیکن وہ ابھی تک ایک دلکش خیال کی طرح حسین اور زندہ ہے۔ کتنی عجیب بات ہے، کیوں؟ اور پھر وہ اسی طرح خلا میں گھورنے لگی۔

مجھے بھی کچھ کہنے کیلئے الفاظ نہ ملے اور میں سوچنے لگا، سورج کی ایک حسین اور رقصاں کرن جس کا وجود یہاں والوں کیلئے ایک رحمت تھا۔ جس کے بارے میں لوگ کہتے ہیں "اب ایسی لڑکی یہاں نہیں مل سکتی،" اس کے وجود نے دو ہستیوں کو تباہ کر دیا، ان دو ہستیوں کو جنہوں نے اسے جنم دیا تھا۔

اس نے پھر کہنا شروع کیا "یہ بھی ایک عجیب بات ہے کہ مجھے کیونکر معلوم ہوا اس کی شادی ہونے والی ہے ــــ ایک کسان نے مجھے بتایا تھا۔ وہ جب بھی شہر آتا ہے میرے پاس ضرور آیا کرتا ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ میرے پرانے مکان کے پاس رہا کرتا تھا لیکن وہ مجھے نہیں جانتا حالانکہ وہ میرے سامنے سکول جایا کرتا تھا۔ میں نے بھی اسے کبھی نہیں بتایا۔ اس روز جب اس نے مجھے شادی کے بارے میں بتایا میرے اوپر عجیب مضحکہ انگیز قسم کے جذبات طاری تھے،" اس نے ایک عجیب انداز میں سر ہلایا "میں نے اپنی زندگی کے حالات کبھی کسی کو نہیں بتائے مگر معلوم نہیں میں نے تمہیں کیوں بتا دیئے آج میں اپنے حواس میں نہیں ہوں"، اس کے اس فقرہ پر میں نے جلدی سے کہا "کوئی ہرج نہیں میں یہاں کسی ایک آدمی سے بھی واقف نہیں"

اس نے ایک آہ بھری، "بڑی تکلیف کی آپ نے، میرا بھی کبھی کبھی کسی سے باتیں کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے" "ہاں تو اس کسان کے چلے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ ایک دن کی چھٹی مناؤں اور اپنی لڑکی کی شادی ہوتی ہوئی دیکھوں،" وہ ہنسنے لگی، "میری رنگینیاں سب کی سب اس رات کو ختم ہو گئی تھیں جس رات مجھ پر وہ جنون سوار ہوا تھا۔ آہ!

میرا باپ بہت سخت گیر آدمی تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد میرے باپ نے مجھے شادی نہ کرنے دی۔ سوتیلی ماں کے پاس رہ کر میری زندگی میں رونا داخل ہو گیا۔ میں بہت نرم دل تھی۔ سوتے سوتے بھی میری آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے تھے، وہ ہمیشہ بھیگی ہی رہیں، ایک نوجوان لڑکی اور آنسو! میرے باپ نے مجھے شادی نہ کرنے دی"!

"تو کیا تم بھاگ گئیں اس کے بعد؟ میں نے آہستہ سے کہا۔

"سب سے بڑی جرأت کا کام جو میں نے ساری زندگی میں کیا۔ بچی کو چھوڑتے وقت میرا جی کٹتا تھا۔ لیکن اس کے سوا دوسرا علاج خودکشی تھا۔ میں ایک نوجوان جلد ساز کے ساتھ بھاگ گئی جو میرے لئے دیوانہ تھا مگر اس نے بھی مجھ سے شادی نہ کی!" وہ پھر ہنسنے لگی اور جلتی ہوئی گھاس کی طرف اشارہ کر کے کہا "جب میں چھوٹی سی تھی تو اس کی گھاس جلانے میں مدد کیا کرتی تھی،" اور وہ پھر رونے لگی مگر اس مرتبہ یہ اتنا تکلیف دہ نہ تھا

گاڑیوں کے راستہ سے ہٹ کر ایک پرانا جوتا پڑا تھا میں اسے دیکھنے لگا۔ پتھروں کے درمیان ایک سیاہ سا دھبہ اور جنگلی پودے اس دلکش دن سے اتنے ہی نامانوس تھے جتنا اس عورت کا ماضی اُسکے حال سے جسے وہ آج تلاش کر رہی تھی اور میرے ذہن میں اس رات کا خیال گھومنے لگا جب بقول اُسکے "اسکے سر پہ جنون سوار تھا،" اور ساتھ ہی ساتھ وہ نوجوان جوڑہ بھی جو اس گرم اور تاریک تنہائی میں جذبات پہ قابو نہ پا کر ان سے مغلوب ہو گیا تھا۔ برف کے چھوٹے چھوٹے گالے دھوئیں اور شعلوں پر سے اڑتے ہوئے اسکے بالوں پر گرنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ ان سے اٹ گئے اور اس نے سسکیاں لیتے ہوئے بچوں کی طرح انہیں پکڑنا شروع کر دیا۔

"میری لڑکی کی شادی کیلئے یہ بڑا عجیب دن ہے،" اس نے کہا اور پھر ایکدم گھبرا کر بولی "نہیں نہیں وہ اپنی ماں کو نہ جان سکے گی، وہ بہت آرام سے ہے،" اور زمین سے اپنا ہیٹ اٹھاتے ہوئے وہ کھڑی

ہوگئی "اب مجھے واپس جانا چاہئے ورنہ گاڑی سے رہ جاؤں گی اور گاڑی سے رہ جانیکے معنی یہ ہیں کہ میں اپنے وعدہ پر نہ پہونچ سکوں گی"

ہیٹ اوڑھ لینے کے بعد اس نے اپنے چہرہ پر ہاتھ پھیرے اور گرد آلود لباس کو جھاڑتے ہوئے وہ جلتی ہوئی آگ کی طرف دیکھنے لگی اس کی بے بسی اور بیچارگی دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اس سڑک پر پڑے ہوئے ردی جوتے کے مانند ہے۔ اپنے ماحول سے بیگانہ اور نامانوس!

"میں نے یہاں آکر غلطی کی" اس نے کہا "مجھے سوائے تکلیف کے اور کیا ملا اور اب تو تم بھی بیٹھے بیٹھے اُکتا گئے ہوگے۔ اچھا خدا حافظ، آپ کے جام کا شکریہ!"

اور اس نے میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جنمیں ہاذاری پن نہ تھا بلکہ خالص انسانی نگاہیں، الجھی ہوئیں اور پریشان۔ دوسری مرتبہ ایک لمحہ کے بعد پھر اُس کے ہونٹ کپکپائے۔

"خدا حافظ!"

اور وہ دروازے میں سے گزر کر نیچے پگڈنڈی کی تہ میں ڈوب گئی۔

اس کے چلے جانے کے بعد کچھ دیر تک میں وہیں برف اور دھوپ میں بیٹھا رہا۔ تب اُٹھ کر جلتی ہوئی گھاس کی طرف دیکھا لہراتے ہوئے شعلے اور نیلا دھواں، خوبصورت اور زندگی بخش معلوم ہو رہا تھا۔ لیکن اپنے پیچھے وہ جلتی ہوئی شاخوں کے ڈھانچ چھوڑ رہے تھے۔

ایک یا دو ہفتہ بعد ان کی جگہ ہری اور ننھی ننھی گھاس کی کونپلیں پھوٹ آئیں گی اور سورج کی روشنی میں لہرانے لگیں گی۔

یوں ہی چلتی رہتی ہے یہ دنیا!

تعمیر اور تخریب، تخریب و تعمیر کتنی عجیب بات ہے!

---

۶۴ نیساں اکبرآبادی

June

خودداریاں

یہ کیوں کہوں کہ نہ تڑپا نگاہِ یار مجھے
مگر قرار تو لے کر کے بے قرار مجھے

دیا فریب طبیعت کو آج پھر میں نے
پھر آچلا ترے وعدوں پہ اعتبار مجھے

وہ ایک تم کہ نظامِ حیات ہے تم سے
وہ ایک میں کہ نہیں کچھ بھی اختیار مجھے

مری نگاہِ تصور نے ان کو دیکھ لیا
جب آچلا تھا ذرا لطف انتظار مجھے

فسردگیِ دلِ وحشت زدہ کی اے توبہ
ہنسی کی بات بھی ہوتی ہے ناگوار مجھے

جب اپنے آپکو دھوکے دئیے ہیں خود میں نے
پھر اور کس کا ہو دنیا میں اعتبار مجھے

مری نظر میں ہی جب ہے بہار کا انجام
مثالِ خار کھٹکتی ہے یہ بہار مجھے

نہ مجھ کو دل پہ ہے قابو نہ انکو نظروں پر
نہ اختیار انہیں ہے نہ اختیار مجھے

بہت عزیز ہیں خودداریاں بھی اے نیساں
شکستِ حسن بھی ہوتی ہے ناگوار مجھے

ایشیا جون جولائی ۱۹۴۲ء

نیا راگ

جوشؔ ملیح آبادی

(منظوم ڈراما)

حرفِ آخر کا ایک ورق

خوب اعجز الکداللہ

(خُدا دریچۂ عرش وا کرکے دُنیا کے مناظر دیکھ رہا ہے ان مناظر میں سے ابلیس کا دربار بھی اک منظر ہے)

ابلیس

اے وباؤ، دہشتو، تاریکیو، بیماریو — آؤ اے میرے رفیقو اے مرے درباریو

ہاں مرے اس قصر پہ لہرا بصد جاہ و حشم — اے گناہوں کے پھریرے اے بغاوت کے علم

حاضری دینے کو اپنی اپنی قبروں سے اُٹھو — اے ٹھگو، اے قاتلو، اے ڈاکوؤ اے خونیو

نکلو اے بوسیدہ لاشو تربتوں کو توڑ کر — آؤ اور اس بام پر منڈلاؤ بازو جوڑ کر

اے گِدھو، چیلو، بھیانک اُلّوؤ جنبش میں آؤ — اپنی آنکھوں کو نکالو اپنے بازو پھڑپھڑاؤ

بازوؤں کو پھڑپھڑاؤ، ظلمتوں کو تھرتھراؤ — ہاں لگاؤ دین کے بھیجے پہ ہاں ٹھونگیں لگاؤ

ظلمتو ہر سمت سے اُمڈو، تجلی سے لڑو — تیرہ شب کا روز روشن ہے اُٹھو چمگادڑو

پر فشاں ہو جلد انسانوں کے اعمال سیاہ — جلوہ گر ہو آدم و حوّا کے فیضانِ گناہ

ہاں پیو اے ساحرو، آ آ کے بحید و حساب — کھوپڑیوں کے کاسہ ہائے سر میں چانڈال کی شراب

ہاں میرے چاروں طرف اے بھتنو دل کھول کر — آؤ اور لڑھکاؤ ہزاروں مُردہ خنزیروں کے سر

ہاں جگاؤ اپنے اپنے بیر اے جادوگرو — اژدہو، ناگو، سنپولو، آؤ مجھ کو گھیر لو

آؤ اے بھوتو چڑیلو برق رفتاری سے آؤ — آؤ چیخو، غل مچاؤ، بھنبھناؤ، ممناؤ

اے ریاکاری کی روحو بدلیاں بن بن کے آؤ — آؤ اُس ابھرے ہوئے گنبد پہ گرجو گھڑگھڑاؤ

آؤ اس میدان میں دوڑو، بڑھو، رینگو، چلو
کیکڑو، گھونسو، مکوڑو، کنکھجورو، بچھوؤ

ہاں دکھا دے ظلمتوں کو اے مرے سینہ کے داغ
اے کثافت بڑھ کے گل کر دے لطافت کے چراغ

(کہ یکایک زبردست دھماکہ کی آواز پیدا ہوتی ہے، تاریکیوں کے دامن دراز تر ہو جاتے ہیں۔ زمین لرزنے اور ہوا چیخنے لگتی ہے، اور دفعۃً ابلیس کا لشکر حاضر ہو کر شور و غل اور ہلچل مچانے میں مشغول ہو جاتا ہے اور ابلیس اپنی بیگم کے دوش بدوش تخت پر بیٹھ جاتا ہے اور بیٹھتے ہی اپنے درباریوں کو حکم دیتا ہے)

شاہزادی کل ہوئی ہے دفن جو اس باغ میں
نور عصیاں کا ہے اب تک جس کے دل کے داغ میں

ہاں چرالاؤ چڑیلو، اس کی زلفِ عنبریں
اس کی آنکھیں، اس کی گردن، اسکے لب، اسکی جبیں

اسکے اعضا کا تناسب، اسکے رخساروں کا نور
لاؤ کشتی میں لگا کر میری بیگم کے حضور

(کہ طرفۃ العین میں مری ہوئی شاہزادی کا جمال ابلیس بیگم کے چہرہ پر دمکنے لگتا ہے۔ تمام درباری مسرت سے تالیاں بجانے لگتے ہیں اور شیطان دوبارہ حکم دیتا ہے)

پیر زن کی چشمِ تر تاریک موتی رول دے
شاہدِ عالم فریبی زلفِ شب گوں کھول دے

ہاں بجا اے کاوشِ عصیاں فواحش کا ستار
ہاں دکھا دے دخترِ انگور سینے کا ابھار

اے پیمانہ تمناؤ، چلو کرتب دکھاؤ
بھیڑیوں کی ہڈیوں سے اپنے تاشوں کو بجاؤ

اے چغل خوری کی دیوی جلد شر کا راگ گا
اے دغا کے دیوتا خونیں عبیروں کو جگا

جلد سارنگی اٹھا اے جھوٹ دانائی کے ساتھ
ہاں نرت کر بدظنی کی روح برنائی کے ساتھ

گونج اٹھو چاروں طرف اے فحش لفظو گونج اٹھو
تال دو جادو کے نعرو گالیوں کو تال دو

ہاں کمر لچکا شرارت، کاکلیں چھٹکا عناد
رقص کر کولھوں پہ رکھ کر ہاتھ اے روحِ فساد

ڈائنو ہاں اپنے اپنے منہ پہ مل کر خاک آؤ
چاپتی کیوں نکر ہو بچے بھاؤ کرکے یہ بتاؤ

حکم دیتا ہوں کہ ہل جا خانۂ عصمت کی نیو
ہاں برہنہ ہو کے گردن کو ہلا اے کام دیو

اے سیہ کاری کے ارمانو بدی کے ولولو
پیشوازوں کو پہن لو، گھونگروؤں کو باندھ لو

(کہ یکایک خبیث ارواح کا رقص و سرود شروع ہو جاتا ہے)۔

("طوفان کی جے شیطان کی جے" کے عنوان سے یہاں اک ترانہ ہے)

(اس ترانہ پر ابلیس فرطِ مسرت سے کہنا شروع کرتا ہے)

شکر ہے ابلیس پر واجب خدائے پاک کا
آگ کے قدموں پہ سر رکھا ہوا ہے خاک کا

جس کے جتنوں مجھ سے بگڑا تھا الٰہ العالمین
آج اس آدم کے بچے ہیں میرے زیرِ نگیں

اس زمیں پر ساں علی الزعم خدائے آسماں
آج میرے ہاتھ میں ہے نوع انساں کی عناں

اور یہ جو ہیں صحیفے طاق میں رکھے ہوئے
ہو چکے ہیں یہ تو کب کے ضبط میرے حکم سے

کر چکا ہوں میں نرالا انتظام ان کے لئے
حلق سے نیچے اُترنا ہے حرام ان کے لئے

دیدنی ہے میری تفسیروں کا عالم آج کل
کثرتِ معنیٰ سے ہر آیت ہے مبہم آج کل

میرے حلقہ میں ہے داخل ہر فقیہ ذی حشم
حکم سے چلتا ہے میرے ہر محدث کا قلم

کی گئی ہے موشگافی اس قدر آیات میں
بہ رہا ہے ہر سفینہ سیلِ تاویلات میں

حکم جس کا رات کو کرتا ہو دن اور دن کو رات
اس سے سجدے کیلئے کہتا تھا رب کائنات

"خاک پر سرکش فرشتے خاک پر رکھ دے جبیں"
تاب اس توہین کی "سرکش فرشتے کو نہیں"

کامرانی ہو چکی ہے مجھ کو اپنے کام میں
ہر پیمبر کی نشانی ہے مرے گودام میں

گو پیوں کی تابِ رُخ، بلقیس کا رنگ جبیں
شیام کی نے، نوح کی کشتی، سلیماں کا نگیں

....

خاتمِ دستِ سلیمان و عصائے موسیٰ
الغرض ہر شے جو تھی وابستۂ پیغمبری

کر لیا ہے قرق اِن سب کو مرے خدام نے
جس کو جُھٹلانے کی قوت ہو وہ آئے سامنے

(اسکے بعد خدا ناراض ہو کر دریچۂ عرش بند کرنے کا حکم دیتا ہے، اور انبیا سے جواب طلب کرتا ہے)۔

مولانا حسرت موہانی

نغمۂ آہستہ خرام

معجزہ دیکھا سرِ شام آپ کا
مطلع خورشید ہے بام آپ کا

یاد ہے ابتک وہ ازراہِ کرم
وعدہ پہ آنا سرِ شام آپ کا

ہار ہوئی آخرِ کار آپ کی
بازی گیا جیت غلام آپ کا

میرا وہ اصرارِ نشیدِ غزل
عذر میں وہ نرم کلام آپ کا

رات کی تنہائی میں آخر وہ خود
نغمۂ آہستہ خرام آپ کا

مٹ کے رہے دونوں بہ تقریبِ وصل
درد مرے دل کا زکام آپ کا

دعوائے میخواری حسرت غلط
آپ کی بوتل ہے نہ جام آپ کا

ساغر نظامی

خاکستر

اُلجھی سُلجھی سانسوں سے اب زیست کا ساماں کیا ہوگا
جینا تو مر مر کے ہوا تھا، مرنا آساں کیا ہوگا

ہوگا کیا جینے کا سہارا زیست کا ساماں کیا ہوگا
لاگ نہیں اب تجھ سے بھی دل کو اے غمِ پنہاں کیا ہوگا

آنسو بن کر ٹپکا بھی تو کارِ نمایاں کیا ہوگا
اے غمِ پنہاں! اے غمِ پنہاں! اے غمِ پنہاں کیا ہوگا

غرق ہوئے تو ہو جائینگے، کارِ نمایاں کیا ہوگا
موج کے اُٹھنے گرنے سے نقصانِ طوفاں کیا ہوگا

اُلٹے سیدھے شکووں پر وہ کافر حیراں کیا ہوگا
عشق ہی آنکھیں نیچی کر لے، حُسن پشیماں کیا ہوگا

حُسنِ بہاراں، کیفِ بہاراں، جوشِ بہاراں کیا ہوگا
دیوانے گلشن میں نہیں مرکز پہ گلستاں کیا ہوگا

طوفاں طوفاں بہتے پھرنا، رسوائی ہے کشتی کی
بچ نکلے تو دُنیا کو اندازۂ طوفاں کیا ہوگا

کشتی نذرِ موجِ بلا ہے، موجِ بلا کا کیا کہنا
ساحل تک پہنچا بھی دیا تو ہم پر احساں کیا ہوگا

ان کی مرضی، جبرِ مسلسل، ہستی سراپا مجبوری
اپنے بس میں کچھ بھی نہیں تا حدّ امکاں کیا ہوگا

قیدِ حیات و جبرِ مشیّت، اُس پہ فریبِ مختاری
تجھ سے بڑھ کر اے غمِ ہستی کوئی زنداں کیا ہوگا

ہوش گریزاں، شکوے لرزاں، گویائی کی تاب نہیں
شوق کے ان طوفانوں میں وہ شوخ پشیماں کیا ہوگا

روتی ہوئی آنکھوں کی جگہ کچھ اشک ہیں رنگیں رنگیں سے
اس سے زیادہ سوزِ محبت اور نمایاں کیا ہوگا

ان کا قصّہ بھید نہیں کچھ، دل کا فسانہ راز نہیں
میرے دو اک اشکوں سے یہ اور نمایاں کیا ہوگا

کعبۂ دل آثارِ شکستہ، ان کی نگاہیں کفرِ تمام
شیخ و برہمن کچھ تو کہو، انجامِ ایماں کیا ہوگا

موسمِ گل میں ٹکڑے ہونا اور ہوا میں اُڑ جانا
اس سے بڑھ کر اے غمِ وحشت مصرفِ داماں کیا ہوگا

کوئل ہو یا بُلبل ہو یا جھرنے ہوں کہساروں کے
کوئی بھلا ساغر کی طرح مستی میں غزل خواں کیا ہوگا

اختر الایمان

شکست

تم سے بیرنگیٔ ہستی کا گلا کرنا تھا!

دل پہ انبار ہے خوں گشتہ تمناؤں کا
آج ٹوٹے ہوئے تاروں کا خیال آیا ہے

ایک میلہ سا ہے مفلوج سی امیدوں کا
چند پژمردہ بہاروں کا خیال آیا ہے

پاؤں تھک تھک کے رہے جاتے ہیں مایوسی میں
پرمحن راہ گزاروں کا خیال آیا ہے

ساقیٔ و بادہ نہیں جام و لب جو بھی نہیں
تم سے کہنا تھا کہ اب آنکھ میں آنسو بھی نہیں

روز دہقان دھندلکے میں ہوس بوتا ہے
رنگ بھرتا ہے شب و روز کے افسانے میں

روز چشموں سے اُبلتا ہے پہاڑوں کا لہو
خشک ہو جاتا ہے جا کر کسی ویرانے میں

لالہ زاروں میں اُگا کرتا ہے بازار کا روپ
ترشے جاتے ہیں صنم روز صنم خانے میں!

کرم شہتوت کے پتوں سے بھی محروم ہیں جو
ریشم و اطلس و کمخواب بنا کرتے ہیں!

میرے پندار کی زنجیر گلی جاتی ہے
اس خرابے میں کہیں کوئی قدح خوار نہیں!

وہی فرسودہ عقائد نئے پیراہن میں
آج دیرینہ ہوس کارہوس کار نہیں!

سرگریباں ہوں مرا زعم نظر ٹوٹ گیا
اب مرے گرد کوئی آہنی دیوار نہیں

اب اسی حال میں رہنا ہے ستم سہنا ہے!
اب مجھے کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں کہنا ہے!

اختر ہوشیارپوری

ہوگئی صبح ہوئے جاتے ہیں افسردہ چراغ

چاندنی نیم کے سائے تلے اب سو بھی گئی
چور ہے تھک کے جوانی کے ہر اک نغمے کی لے
دل کی آواز فضاؤں میں کہیں کھو بھی گئی

دوشِ احساس پہ اب بار ہیں مینا و ایاغ

آہ وہ بیتے ہوئے لمحے محبّت کے امیں

تیری زلفوں کی گھنی چھاؤں میں جو سستانے
ہانپتے آئے تھے تپتے ہوئے صحراؤں سے
رس بھرے ہونٹوں سے بے نام سی لذّت پانے

رہ گئے تیرگیٔ غم کے تلے دب کے کہیں

اب ترے ہاں نہیں آؤں گا، نہیں آؤں گا

منزلیں لاکھوں ہیں ٹھکرا کے جنہیں آیا تھا
رہ میں تارے بھی ہیں، میخانے بھی، گل بھی جن سے
اپنی معصوم جوانی کو بچا لایا تھا،

اب کہیں بند کئے آنکھ چلا جاؤں گا

ہوگئی صبح، ہوئے جاتے ہیں افسردہ چراغ

ایشیا۔ جون جولائی ۱۹۴۲ء

ظفر تاباں دہلوی

غزل

وہ بیخودی ہے کہ اب بیخودی نہ جائے گی
میری شراب کی مستی کبھی نہ جائے گی

نہ جائے گی خلش عاشقی نہ جائے گی
جگر کا درد نظر کی نمی نہ جائے گی

حریمِ خلوتِ جاناں ہے وہ مقامِ ادب
نگاہ سے بھی جہاں بات کی نہ جائے گی

ہزار حسن میں شیوے ہوں بے حجابی کے
مگر نگاہ کی شرمندگی نہ جائے گی

ہزار بار کرے حسن اہتمام سکوں
دماغِ عشق کی آشفتگی نہ جائے گی

ہزار عشق کو ہو ناز آشنائی پر
مگر وہ حسن کی بیگانگی نہ جائے گی

اسی نظر میں نہاں رازِ عاشقی ہوگا
وہ اک نظر جو تری سمت کی نہ جائے گی

یہی رہی خلشِ عاشقی اگر تاباں
تو بے قراریِ دل ضبط کی نہ جائے گی

نواب جعفر علی خاں اثر بی۔اے

غزل

عرق آلود کسی کا رُخِ تاباں ہونا
اپنے ہی نور میں خورشید کا پنہاں ہونا

زیرِ لب کہکے کچھ، انگشت بدنداں ہونا
یہ ہے دیوانہ بنانا کہ پشیماں ہونا!

کچھ نہیں اسکے سوا جوشِ گلِ موسمِ گل
ایک ہنگامہ پے چاک گریباں ہونا

عشق پر ختم ہے یہ طرزِ گرفتاریِ دل
آپ ہی اپنی تمنّاؤں کا زنداں ہونا

خشک آنکھوں میں پھر اک اشکوں کا طوفاں اُمڈا
سیکھ لے تم سے کوئی حال کا پرساں ہونا

عشقِ شوریدہ کو سودا ہے اُسی منزل کا
راز بنتا ہے جہاں راز کا عرفاں ہونا

عشق ہے بزمِ تماشا بھی، تماشائی بھی
آپ ہی دیکھنا اور آپ ہی حیراں ہونا

یاد اُس عہد کی جب کان سُنا کرتے تھے
گُل کی آغوش میں نکہت کا غزلخواں ہونا

ہے اثر دل کے دھڑکنے میں بھی نغمہ، لیکن
پہلے درکار ہے دو روحوں میں پیماں ہونا

شورؔ (علیگ)

طیّارہ

موت کا اک قہقہہ غارت گری کی اک ہنسی
ایک آشفتہ تباہی ایک برہم نیستی

بربریت کی قسم پیمانِ تخریبِ حیات
ایک ایسی صبح جس کی گود میں تاریک رات

سینۂ ایجاد کا اک زخم خونابہ فشاں
ترکشِ غارتگری کا اک خدنگ بے اماں

اک پریشاں سی قیامت ایک آوارہ عذاب
ایک رم خوردہ تغیّر ایک بھٹکا انقلاب

ایک ظلمت ریز بادل ایک آندھی تند و تیز
اک ہلاکت خیز طوفاں شعلہ بیز و شعلہ ریز

نیستی کی چیخ کربِ زندگی کی اک پکار
اک تلاطم خیز ساحل اک خزاں پرور بہار

چرخ پیما ایک آوارہ بگولا موت کا
جنبشیں کھاتا ہوا سا ایک جھولا موت کا

ایک بہتا سا جزیرہ ایک اُڑتا سا غبار
اضطرابِ روح فطرت فتنۂ گیتی شکار

ایک کوہِ آتش افشاں ایک کھائی موت کی
ایک ''انگڑائی'' فنا کی اک ''جمائی'' موت کی

ایک معلق زلزلہ انگڑائیاں لیتا ہوا
زندگی کو اک پیغامِ فنا دیتا ہوا

ہم نشیں وہ آسماں پر دیکھ طیّارہ اُڑا
آگ کے طوفاں کو لیکر دیکھ انگارا اُڑا

بادلوں کو چیرتا کہرے میں درّانے لگا
ابر کے ٹکڑوں میں چھپ چھپ کے نظر آنے لگا

اب فنا کے ہاتھ ہوگا زیست کا برہم نظام
موت اس صورت سے لیگی زندگی سے انتقام

آسماں میں اب یہ طیّارے اُڑائے جائیں گے
اب اسی صورت سے قصر و بام ڈھائے جائینگے

اب فضا میں آتشیں طوفاں اُٹھائے جائیں گے
اب بساطِ خاک پر شعلے بچھائے جائینگے

مسندوں میں آگ، محلوں میں شبستانوں میں آگ
دامنوں میں آگ بھڑکے گی گریبانوں میں آگ

کوچہ و بازار میں شعلے، طرب خانوں میں آگ
معبدوں میں آگ لگ جائے گی ایوانوں میں آگ

جنگلوں میں آگ بھڑکے گی گلستانوں میں آگ
کشتیوں میں آگ ہوگی اور طوفانوں میں آگ

آگ کے شعلے گرائے جائینگے افلاک سے
آگ کے طوفاں اُٹھائے جائینگے اب خاک سے

خرمنِ تہذیب سے اُٹھتا رہے گا اک دھواں
اب یوں ہی گزرے گا ہستی سے فنا کا کارواں

یہ جو اُڑتا جارہا ہے آسماں پر ہم نشیں
ہاں ''سکونِ روحِ آدم'' ہے یہ طیّارہ نہیں

خمار بارہ بنکوی

غزل

نہیں ہوتا مداوائے غمِ پنہاں نہیں ہوتا
بظاہر ہنس لیا جاتا ہے دل خنداں نہیں ہوتا

پریشانی میں ہنس دینا جسے آساں نہیں ہوتا
وہ کم ہمت سزاوارِ غمِ جاناں نہیں ہوتا

محبت نے مجھے پہنچا دیا ہے اس بلندی پہ
کہ اب اُن سے بھی میرے درد کا درماں نہیں ہوتا

طوافِ کعبہ برحق۔ بندگی واجب مگر زاہد
بغیرِ مے پرستی آدمی انساں نہیں ہوتا

حفاظت چاہیئے دلکی حفاظت چھپو گلشن کی
اُجڑ جاتا ہے دل گلشن کبھی ویراں نہیں ہوتا

جہاں بھی جی میں آئے سر جھکا دے بے نیازانہ
مذاقِ سجدہ پابندِ درِ جاناں نہیں ہوتا

نشیمن کیا چمن سے ربط ہونا چاہیئے دل کو
نشیمن کے اُجڑنے سے چمن ویراں نہیں ہوتا

محبت کو سمجھنا ہے تو ناصح خود محبت کر
کنارے سے کبھی اندازۂ طوفاں نہیں ہوتا

سبھی کچھ ہو رہا ہے اس ترقی کے زمانے میں
مگر یہ کیا غضب ہے آدمی انساں نہیں ہوتا

فراقِ یار میں مرنا خمار آساں ہوتا ہے
فراقِ یار میں جینا خمار آساں نہیں ہوتا

سلیمان ادیب

بنتِ عم سے!

تم سے اک بات ہے کہنے کی بڑی اچھی بات
سُن کے تم ہنس ہی پڑو گی وہ ہے کچھ ایسی بات
یہ بھی ڈر ہے کہ کہیں تم نہ خفا ہو جاؤ
یہ بھی ممکن ہے کہ اک سوچ میں تم کھو جاؤ
تم سے کہنے کا بہت دن سے ارادہ تھا مرا
اے خوشا! طالعِ بیدار کہ وقت آ ہی گیا

دیکھتی ہو وہ شفق پھول رہی ہے کیسی
شاید اس مہندی لگے ہاتھ کی سُرخی ہو گی
طائر اُڑ اُڑ کے بسیرے کو چلے آتے ہیں
نرم ہے موجِ ہوا پھول کھلے جاتے ہیں
چاند کے روپ میں اتنی تو نہ تھی رنگینی
دیکھوں! ٹوٹی تو نہیں کوئی تمہاری چوڑی!؟

ہاں مگر یاد رہے یاد رہے راز ہے یہ
دل میں دو اس کو جگہ دل ہی کی آواز ہے یہ
لو سنو کان ادھر لاؤ مرے مُنھ کے قریب
اے لو شرماتی ہو تم، تم بھی ہو کس درجہ عجیب؟
یہ کہا "جلد کہو" خیر تو پھر سُن لینا
کام ہے تم کو کسی اور کو یہ جُل دینا
کیوں جھجکتی ہو کوئی چیز لئے لیتا ہوں؟
کیوں بگڑتی ہو ادھر آؤ کہے دیتا ہوں
کچھ نہیں جانتیں؟ انجان بنی جاتی ہو
کونسی نظم ہے وہ تم جو کبھی گاتی ہو
"کونسی نظم؟" وہی نظم جو پیاری ہے بہت
ہاں وہی نظم جو تم کو بھی تو بھاتی ہے بہت
جس میں شاعر نے کہا ہے کہ "محبت ہے مجھے
بنتِ عم تیرے تصور ہی میں راحت ہے مجھے"

چاہتا ہوں میں تمہیں بس یہی کہنا تھا مجھے
کیا کہا، اب نہیں بولو گی کبھی تم مجھ سے؟

ایشیا۔ جون جولائی ۱۹۴۲ء

کسوٹی

تازہ رسائل

برہان-جون-

فلسفہ-

فلسفہ کا وجود انسان کے شکوک کی بنیاد پر ہے۔ ہر سوچنے والا انسان جب ان سنی سنائی باتوں یا ایک عام روش سے اکتا جاتا ہے تو اسکے خیالات اسکے گرد حلقہ کر لیتے ہیں۔ وہ کیوں، کس طرح؟ اور کیونکر؟ کے ایک جال میں گھر جاتا ہے، اس کا دماغ اُسے بار بار اُکساتا ہے۔ اگر یہ یوں ہی ہے تو یوں ہی کیوں ہے۔ کسی اور طرح کیوں نہیں اور خیالات کی یہی رو دماغ کو فکر کی دعوت دیتی ہے۔ انسانیت اور ماورائے انسانیت کا تخیل آدمی کو گھیر لیتا ہے۔ طبعیات اور مابعد الطبعیات اخلاقیات اور مدنیات، خیر و شر، حسن و قبح، رحم و انصاف اور اسی قسم کی تمام چیزیں جن سے زندگی کا ایک گہرا تعلق ہے آدمی انکو بار بار سوچتا ہے اور یہی سوچنا زندگی کی ان منزلوں میں آدمی کو گھسیٹ کر لے آتا ہے جہاں سے انسان کی سطحی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ ان کے ذہن میں بار بار یہ خیال پیدا ہوکر کہ زندگی محض خوردن، نوشیدن اور مردن نہیں اور ایک نئی راہ پر ڈالدیتے ہیں۔

اس طریقہ سے ہماری تہذیب و تمدن اور معاشرتی اصولوں نے جنم لیا۔ اور ہر شخص نے اپنی حیثیت اور فکر کے مطابق اصول مرتب کئے۔ ایک گروہ ایسے لوگوں کا پیدا ہو گیا جو زندگی کا مفہوم اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں سمجھتے تھے کہ ؎

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہو گیا جن کا خیال تھا کہ زندگی کو ضمیر کی آواز پر چھوڑ دینا چاہئے۔ چونکہ ضمیر ہی ایک ایسی چیز ہے جو بلا واسطہ خدا کی آواز کو سن سکتا ہے اور سنتا ہے۔ ایسے گروہ کے کچھ لوگوں نے زندگی کو محض ایک فریضہ تصور کیا اور انکی زندگی ایک سپاہی کی زندگی بنکر رہ گئی "فرض برائے فرض" کے علاوہ انکی زندگی میں ذاتیات کو کہیں دخل نہیں۔

تیسرے گروہ کے لوگوں کے نزدیک زندگی تنازع للبقا کے سوا کچھ بھی نہ رہی۔ اسی حیوانی کشمکش سے ان کے خیال کے مطابق ہم نکلکر آئے تھے اور اس زندگی میں بھی ہم کو وہی کشمکش جاری رکھنی چاہئے۔ جس طرح اکثر جانور گروہوں میں رہتے ہیں، محض اپنی حفاظت کی غرض سے اسی طرح ہم بھی گروہوں میں رہتے ہیں اور ہمیں اس جماعتی نظام کے ساتھ ساتھ افراد کا بھی خیال رکھنا چاہئے

چوتھا گروہ انہی تین قسم کے سوچنے والوں کے بین بین پیدا ہو گیا او انھوں نے ان تینوں قسم کے سوچنے والوں کے بہترین اصول لیکر یکجا کر دیئے۔

ڈاکٹر ولی الدین کے متذکرہ بالا مضمون سے جو انھوں نے پچھلے ماہ کے برہان میں لکھا ہے۔ ہم یہاں کچھ پیش کرتے ہیں:-

"موجودہ زمانہ میں ہمارا نقطۂ نظر زیادہ تر انفرادی واقع ہوا ہے ہم دنیا پر ہیئتی نگاہ سے غور نہیں کرتے بلکہ معاشرتی، سیاسی، ادبی، اخلاقی اور مذہبی نگاہ سے اسکی تحقیق و تدقیق کرتے ہیں۔ قدما یونان کو ثبات و تغیر عالم کا مسئلہ پریشان کیا کرتا تھا لیکن تغیر سے انکی مراد مادی تغیر تھا یعنی مادی ذرات یا اجزا کی حرکت یا نشو و نما، زوال و فنا کے مظاہر۔ چنانچہ زینو کا خیال تھا کہ قدرت کے کارخانہ میں تغیر محال ہے۔ اسکو بظاہر جو تغیر دکھائی دیتا ہے وہ محض فریب و التباس ہے، لیکن ہر قلیتوس کو یقین تھا کہ ثبات و سکون کائنات کی کسی شے میں نہیں۔ دنیا سر تا پا تغیر، تجدد، تنوع ہے، یہ اور اسی قسم کے مسائل اس میں شک نہیں ابتک لاجواب ہیں لیکن ہماری دلچسپی دنیا کے کئی اور طرح کے تغیر سے وابستہ ہو گئی ہے، ہم معاشری رسوم، سیاسی علائق، اخلاق و آداب مذہب اور ادبی معیارات کے تغیرات سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں لیکن اس قسم کی تغیر پذیر دنیا بھی توجیہ کی اسی قدر محتاج ہے جیسی کہ اجزائے مادی کی تغیرات والی دنیا۔ لہذا فلسفہ کی ضرورت یقینی، فرق صرف اتنا ہے کہ اب فلسفۂ حیات، اسکی قدر و قیمت، اسکی بدایت و نہایت، اور غرض و غایت کی توجیہ کرتا ہے اس لئے ارتقا، ترقی، ذہن کے طریقے، کردار و معاشرت کے مسائل زیادہ نمایاں اور پیش پیش ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ ہمیشہ کیلئے صحیح ہے کہ فلسفہ اس دنیا کو سمجھنے کا نام ہے جس میں ہم اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

شاید قارئین میں سے بہت کم ایسے ہونگے جن کے ذہن نے کبھی نہ کبھی اس قسم کے سوالات کو نہ اٹھایا ہوگا۔ کیا خدا کا وجود ممکن ہے، یا سوائے مادہ اور اینرجی کے کوئی شئے نہیں؟ مادہ کا مایۂ خمیر کیا ہے؟ کیا درد سے زیادہ کوئی چیز حقیقی ہو سکتی ہے؟ اگر جلوہ فرمائی صرف مادہ کی ہے تو درد کیا چیز ہے کیا یہ ذہن میں نہیں پایا جاتا؟ تو کیا ذہن مادے سے جدا نہیں، امیر غور و فکر کرنا، درد و الم سہنا، کیا صرف مادی ہی جسم سے تعلق رکھتا ہے، مادی

جسم کا وظیفہ ہے یا اس سے جداگانہ ہے؟ میں زندہ ہوں! حیات کیا ہے؟ وہ مے کیا ہے جو بقول اقبال "تلخ تر و نیکو تر است"؟ ایک روز مجھے موت آئیگی، موت کیا ہے؟ کیا یہ انسانی شخصیت کا خاتمہ ہے؟ ابو العتاہیہ نے حیرت کے عالم میں کیا خوب پوچھا تھا۔

اَلْمَوْتُ بَابٌ وَکُلُّ النَّاسِ یَدْخُلُہٗ   یَا لَیْتَ شِعْرِیْ بَعْدَ الْبَابِ مَا الدَّارُ

ہم آزاد نظر آتے ہیں، کیا یہ صحیح ہے؟ میر کا خیال تھا ع

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی!

حافظ کا خیال تھا کہ ع

پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند!

واقعہ کیا ہے! مجھ سے آپ سے ہر طرح کے افعال سرزد ہوتے ہیں، بعض اُن میں کے صائب ہیں اور بعض قابلِ پذیرا، صواب خطا کے کیا معنی ہیں؟ انکے معیار کیا؟ ہم میں سے بعض تلاش زر میں سرگردان ہیں بعض شہرت کے خواہاں اور بعض لذت کے دلدادہ اور

"خوش باش دمے کہ زندگانی این است"

کے پیرو۔ کیا یہ درحقیقت اعلیٰ قسمیں ہیں؟ ان سے اعلیٰ وارفع نصب العین موجود ہیں؟ مثلاً رواقیہ نے "طمانیت نفس" کو خیر و برتر قرار دیا تھا، دنیا کی کوئی مصیبت دنیا کی کوئی خوشی، اطمینان خاطر کو صدمہ نہیں پہنچا سکتی۔ چنانچہ پی ہتیوس نے روما کے جیل خانہ میں فلسفے کے تسلی بخش لذات پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا۔ کیا اس طرح تلاش حق، فنون لطیفہ کا ذوق وغیرہ اعلیٰ قسمیں نہیں قرار دیجا سکتیں! ہم یہ تمام سوالات اٹھا سکتے ہیں، کیا ان کا جواب دینا ممکن ہے؟ علم انسانی کی حدود کیا ہیں۔ اس کی اڑان کتنی ہے؟ علاوہ ازیں فطرت و صنعت میں خوبصورت اشیاء میرا محاصرہ کئے ہوئے ہیں۔ اکثر بدصورت بھی ہیں، حسن کیا ہے؟ ایک خوبصورت عمارت میں، ایک حسین چہرے میں، موسیقی کے ترنم میں وہ کیا چیز ہے جس سے ہم کیف اندوز ہوتے ہیں؟ اگر آنکھیں نہ ہوتیں۔ ذہن نہ ہوتا تو کیا پھر بھی فطرت لباس حسن میں ملبوس ہوتی! یہ سب فلسفیانہ سوالات ہیں۔ ان کا پیش کرنا انسان کی فطرت کا تقاضا ہے، ان پر غور کرنا، حکیمانہ طور پر، تحقیق و تدقیق کے ساتھ ان کا مطالعہ کرنا۔ ان کے جواب فراہم کرنیکی سعی کرنا گویا لا حاصل ہی فلسفہ ہے، یا جیسے فلسفہ کے شیدائی ولیم جیمسن نے کہا ہے "فلسفہ واضح طور پر فکر کرنے کی ایک غیر معمولی و مستقل کوشش کا نام ہے" یہ کام دیوتاؤں کا نہیں، جانوروں کا نہیں، انسان کا ہے، ہر انسان کا خواہ وہ حیوانیات کا پروفیسر ہو یا تاریخ کا!"

گل کر دیتیں تو پہلے ہی سے یہ زرد چراغ

آج بھی عیش کے لمحات فسردہ کیوں ہوں

جگمگاتے ہوئے ریشم کا پرانا ملبوس
جسم افسردہ کی زردی کو چھپا ہی لے گا
رات کے وقت بہر حال یہ نیلا فانوس
تم سمجھتی ہو کہ خلوت کو سجا ہی لے گا

کل یہی ساز، یہی گیت، یہی جامِ شراب
جھلملاتی ہوئی دیوار پہ تھراتے تھے
رات یہ شمع، یہ تارے، یہ سنہرا مہتاب
خلوت عیش میں کچھ سرد ہوئے جاتے تھے

دھندلے دھندلے سے انہی ریشمی پردوں کے ادھر
حسن غربت کے نظارے بھی یہاں کیوں کھوں
جنکے چہروں سے مجھے اپنے گناہ آئیں نظر
ایسے وہ چاند ستارے بھی یہاں کیوں کھوں

ہاں ہٹا دو مری نظروں سے یہ پژمردہ چراغ
مرے گاتے ہوئے جذبات فسردہ کیوں ہوں

ساقی جون۔ (سلام مچھلی شہری)

نظم پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نظم کا شاعر اپنے گرد و پیش سے کچھ بیزار سا ہے۔ محفل عیش میں داخل ہونے سے پہلے اسکی نظر اس زرد چراغ پر جاتی ہے جو اس انجمن نشاط کیلئے ایک برا شگون ہے۔ اگر ہم اشعار

کے ساتھ ساتھ ذرا سا ذہن پر زور دیکر کچھ سوچیں تو ہمیں اسکے پس منظر میں ایک ایسے انسان کی تصویر نظر آئیگی جس کے چہرہ پر ایک حزن وملال اور آنکھوں سے بیزاری ٹپکتی ہو ہے۔ اسکی نگاہوں کے سامنے محفل عیش ونشاط کا باب وا ہے، اور وہ اپنے آپکو اس میں غرق کر دینا چاہتا ہے۔
اسکی آمد اس محفل نشاط میں آج پہلی بار نہیں ہوئی۔ وہ اکثر آتا ہے، اور جس طرح اس سے پہلے اسکے وقتی تعیش میں کوئی فرق نہیں آیا اسی طرح وہ آج بھی نہیں چاہتا کہ اسمیں کوئی فرق آئے لیکن صرف شمع ہی کے الگ کر دینے سے ہی تو عیش کے لمحات فسردہ ایک امنگ میں نہاں بدل جائیں گے اسکے لئے وہ کہتا ہے کہ جہاں اور چیزوں کا تعلق ہے انہیں یہ ریشمی غلاف تو پرانے ملبوس ڈھاپ لیں گے۔ جہاں تک زندگی کی بے بسی کا تعلق ہے وہ وہ ایک تاریکی میں مدغم ہو کر رہ جائیں گے۔

نظم میں کہیں بھی نمایاں طور پر نہیں معلوم ہوتا کہ شاعر یہ تمام کچھ کہہ کیسے رہا ہے لیکن اس پس منظر پر نظر ڈالنے سے اس انسان کے سامنے ایک نسوانی پیکر نظر آئیگا۔ بہت دھندلا اور بہم سا جو پرانے ریشمی ملبوس اتارنیکے بعد زندگی کی ایک بھیانک تصویر ہے۔ غربت کا ایک مستقل نظارہ اور اس تصور کے ساتھ ہی اس ماحول میں سینکڑوں نسوانی پیکر عریاں، زرد، بے بس۔ انسانی گناہوں کی ایک تصویر، چاروں طرف منڈلاتے ہوئے نظر آئیں گے،

یہ نظم فن کاری کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ ایک فن کار کی حیثیت سے سلام جو کچھ پس منظر میں رکھنا چاہتا ہے وہ وہیں رہتا ہے اور جس انداز سے نظم کا آغاز کرتا ہے وہ انداز آخر تک اسی طرح قائم رہتا ہے۔ اس کا منتہا اس محفلِ عیش میں آنے سے صرف یہ ہے کہ وہ ایک لمحہ کیلئے ان انسانی آلائشوں سے منہ موڑ لینا چاہتا ہے۔ جیسے دیکھتے دیکھتے وہ اکتا گیا ہے اور نہیں چاہتا کہ اب دیکھے تاوقتیکہ اس کا یہ خمار اور یہ ایک وقتی لطف ختم نہو جائے۔ اسکے علاوہ ایک چیز یہ بھی ہے کہ اگر وہ اس زرد شمع کی روشنی میں ان پرانے ریشمی ملبوس اور زرد اجسام کو دیکھے گا تو اسے اپنے گذشتہ واقعات کا خیال آئیگا۔ اس محفلِ عیش کا جس کی داد وہ اکثر دیتا رہا ہے اور وہ اپنے گناہوں سے پشیمان ہوگا۔ اس کا لطف ایک مستقل تکلیف بن کر اسکے دل میں ایک کسک پیدا کر دیگا۔ اور وہ نہیں چاہتا کہ اس کے گاتے ہوئے جذبات فسردہ ہو جائیں

وہ انہیں اجاگر کر کے لایا ہے۔

وہ نظم میں ابتدا ہی سے ایک تاثیر پیدا کرنا چاہتا ہے ایک ہی سلسلہ خیال کو لیکر چلنا چاہتا اور اسے آخر تک قائم رکھتا ہے نظم کے شروع میں خیال ہوتا ہے کہ کہیں وہ ان تمام چیزوں کو دیکھ کر جو محفل عیش میں اس کے سامنے آنیوالی ہیں لڑکھڑا نہ جائے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ وہ ایک ہی وقت میں تعیش کوش بھی ہے، نقاد بھی، اور ایک فن کار بھی۔ لیکن اس کا یہ پہلو جس میں وہ ایک نکتہ چیں کی حیثیت سے نسوانی زندگی اور محفل عیش کو دیکھتا ہے اتنا دبا ہوا ہے کہ وہ آخر میں ایک فن کار ہی ثابت ہوتا ہے سلام کی اکثر نظمیں وہ ایک فن کار کی تراش خراش کا اچھا نمونہ ہیں۔ اگرچہ ان میں کہیں کہیں لغزش بھی ہو جاتی ہے۔

ہمارا دور بیداری کا ایک احساس ہے، ایک انسانی ہمدردی کی رو، ایک خلفشار اور خلجان میں نہ صرف ایک آدمی بلکہ ہر شخص گرفتار ہے۔ ہر ذی حس اور سوچنے والا دماغ۔ اس خلفشار میں نہ صرف سلام ہے۔ بلکہ یوسف ظفر بھی

چور پکڑا گیا ـــــ پکڑا ہی گیا آخر کار
رات کے ٹوٹتے تاروں کا سنبھالا لیکر
چپکے چپکے وہ دبے پاؤں ہوا تھا داخل
بھوک اک خنجرِ بیباک تھی اس کے دل میں
دل کی دھڑکن ـــ وہ تو چہرے پہ نکھر آئی تھی
کئی راتوں کی تھکن اس کی نظر کے بل پر
آنکھ کے پردۂ سیمیں پہ اتر آئی تھی
اسکی پژمردہ جوانی کا وہ ڈھانچا تو نہ تھا
ایک احساس کا پتھرایا ہوا لاشا تھا

سامنے کمرے میں کیا کچھ نہ تھا ـــ سب کچھ ہی تو تھا
وہ زر وسیم کی تعمیر کا گورکھ دھندا
اپنے خود کاشتہ اصنام کا انبارِ عظیم
عیش کے جادۂ ہموار کی روشن شمعیں
مسکراتی ہوئی تصویریں بنی جاتی تھیں
مسکرا رہی تھی ـــ مسکرا رہی تھی ـــ مسکرا رہی تھی ـــ
(یوسف ظفر)

ادب لطیف۔ جون۔ زندگی کی جس ضرورت کیلئے سلام زرد
اجسام ریشمی ملبوس میں پوشیدہ کر رہا ہے اسی ضرورت کو ظفر ایک دوسرے
طریقہ سے پیش کر رہا ہے۔ ایک فنکار کی تعریف یہ ہے کہ وہ کوئی بھی موضوع
ہو اسے اس طرح پیش کرے کہ کانوں کو گراں اور حسن لطیف پر بار نہ گزرے
اس موضوع پر جس پر ظفر اظہار خیال کر رہا ہے پہلے بھی نظمیں لکھی جاچکی
ہیں۔ لیکن انھیں پڑھنے سے وہی لطف آتا ہے جو ایک فوجی بینڈ کو سنکر
آسکتا ہے۔ لیکن ظفر صرف

چور پکڑا گیا ــــ پکڑا ہی گیا آخرکار

کہہ کر دماغ کو ایک رومانوی اور مضطرب ماحول کی طرف
متوجہ کر دیتا ہے۔ جسے پڑھنے کے بعد جذبات ایکدم ایک لاوے کیطرح
ابل نہیں پڑتے بلکہ ایک کسک بنکر بے چین کر دیتے ہیں۔

رات کے ٹوٹتے تاروں کا سبنھالا ایک آرٹسٹ ہی کے قلم سے
نکل سکتے ہیں اور پھر اس کے پیچھے جو گداز اور سوز چھپا ہوا ہے اسکی کیفیت
کچھ وہی شخص زیادہ سمجھ سکتا ہے جس کو ایک امید و بیم کی گھڑی درپیش
آئی ہو۔ نظم حقیقت در و مان کے ملے جلے تاثرات لئے ہوئے آخر تک
ایک لطیف طنز بن کر رہ جاتی ہے۔ اور کبھی کبھی طبیعت میں ایک ہلکا۔
نفرت کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔

وہ زر و سیم کی تعمیر کا گورکھ دھندا
اپنے خود کاشتہ انصاف کا انبار عظیم
عیش کے جادۂ ہموار کی روشن شمعیں

یہ سطریں جہاں ہمارے سامنے ایک مشاق نقاش کو پیش
کرتی ہیں۔ وہاں ایک تبسم زیر لب کبھی مجبور کرتی ہیں جنہیں کڑواہٹ
اور تلخی بدرجۂ اتم ہے اور جب ہم سنتے ہیں کہ۔

اسکی پژمردہ جوانی کا وہ ڈھانچا تو نہ تھا
ایک احسان کا پتھرایا ہوا لاشا تھا

اس وقت اسکے سوا اور کچھ نہیں سوجھتا کہ رفتہ رفتہ ان چیزوں
کی بیخ کنی کیجائے۔ اس طرح کہ۔۔

عیش کے جادۂ ہموار کی روشن شمعیں دھندلی پڑجائیں

اگر اس طرف سلام اور ظفر روزگار کے شاکی ہیں۔ تو دوسری
طرف جذبی اور روش غم دل کے شاکی ہیں۔ اور ان دونوں سے کہیں
نجات نہیں۔

اپنے بھیگے ہوئے رخسار دوں اک آہ کے ساتھ — مرے جلتے ہوئے ہونٹوں پہ نہ رکھیگا کوئی
رب نگیں کی خموشی پہ نہیں بگڑوں گا — مری بیباک نوائی پہ نہ روٹھیگا کوئی
دل نازک کے دھڑکنے کی سنوں گا نہ صدا — مری گھٹتی ہوئی آہوں پہ نہ چونکیگا کوئی
مری آہٹ پہ لجاتے ہوئے میری جانب — ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے نہ آئیگا کوئی
انکے ماتھے پہ پڑیگی نہ بناوٹ کی شکن — انکے کھینچے ہوئے ہاتھوں کو نہ چومے گا کوئی
مری وحشت کے تماشے نہیں ہونگے نصیب — انکے الجھے ہوئے بالوں سے نہ الجھے گا کوئی

دل ناشاد تری چپ سے مگر کیا ہوگا
تری فریاد کو سمجھا ہے نہ سمجھے گا کوئی

ادب لطیف جون۔ (جذبی)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جذبی ایک تذبذب اور کشمکش کے عالم میں
سر جھکائے زندگی کے گذرے ہوئے لمحات پر غور کر رہا ہے۔ خیالات کا ایک
سلسلہ ہے جو بندھا ہوا ہے۔ ذہن گذشتہ واقعات کو دہرا رہا ہے اور ایک چھیڑ
چھاڑ اور لطیف رمز و کنایات جو دو جذبات سے بھرے ہوئے دلوں میں ہوا
کرتے ہیں ان کا تصور بندھا ہوا ہے۔ کبھی انھیں حنا آلود کھنچے کھنچے ہاتھوں کا
خیال آتا ہے جنہیں وہ چومنے کیلئے بیقرار رہا کرتا تھا۔ اور کبھی اس التہاب
شوق کا۔ جب کوئی اسکے جلتے ہوئے ہونٹوں پر اپنے رخسار رکھدیا کرتا تھا
اسے وہ منظر یاد آجاتا ہے۔ جب کوئی اسکی آہٹ پر اپنے آنچل کو نرم و
نازک انگلیوں سے ہٹاتا ہوا لجاتے ہوئے اسکی طرف آیا کرتا تھا اور کبھی جب
اسکی انگلیاں کسی کے الجھے ہوئے بالوں سے کھیلا کرتی تھیں۔

اسے ان لطیف احساسات کا تصور بے چین کر دیتا ہے اور وہ
جس طرح خیالات اس کے ذہن میں آتے تھے اور جس طرح واقعات
ہو چکے ہیں بعینہ اسی طرح انہیں اٹھا کر اپنے قلم کی ایک جنبش سے کاغذ
پر لے آتا ہے۔ جس طرح اس نے اپنے ذہن میں دیکھا اسی طرح ہم نے
اسے کاغذ پر دیکھا اور اپنے تخیل میں ایک تصویر بنالی اور بقول شخصے
بہترین شاعری فن کے لحاظ سے وہ ہے جسکی تصویر بن سکے اور ہم بلاشک
وشبہ جذبی کی اس نظم کو پڑھ کر ایک تصویر مکمل کر سکتے ہیں۔

رات بھر نکہتِ بیدار گل افشاں ہی رہے
صبح تک خلوتِ شب بزمِ چراغاں ہی رہے
گرم رو قافلۂ شوق فـراواں ہی رہے
جذبِ پنہاں کو یوں ہی راہ نما رہنے دے

کس کو معلوم ہے کس وقت چلے آئیں وہ
عالمِ شوق کو غافل نہ کہیں پائیں وہ
دلِ ناداں کہیں آکر نہ چلے جائیں وہ
بربطِ غم کو یوں ہی نغمہ سرا رہنے دے

بے اثر ہو غمِ الفت یہ نہیں ہو سکتا
حاصلِ عشق ہو فرقت یہ نہیں ہو سکتا
ان کو لائے نہ محبت یہ نہیں ہو سکتا
اس پہ سب فلسفۂ یاس فزا رہنے دے

دلِ ناداں نہیں معلوم وہ کب آ جائیں
در کاشانۂ اُمید کھلا رہنے دے

(روشن صدیقی)

---

۸۲ ادیب جون۔

جذبی اور روشن کے فلسفۂ محبت میں بہت بڑا فرق یہاں آن کر پڑ جاتا ہے جہاں جذبی کہتا ہے

پھر تری بات کو سمجھا ہے نہ سمجھے گا کوئی

اور روشن کے خیال میں

اب یہ سب فلسفۂ یاس فزا رہنے دے

روشن مایوسی کو گناہ خیال کرتا ہے اور اسی لئے اسکے یہاں حزن و ملال نہیں یا یہ کہ اسکی نگاہیں ایسے مناظر سے دو چار ہونیکی قوت نہیں رکھتیں۔ اپنے آپ کو امید کی آخری منزلوں پر دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کو اپنے جذبۂ عشق پر اتنا اعتماد ہے کہ وہ یہ کہہ اٹھتا ہے۔

بے اثر ہو غمِ الفت یہ نہیں ہو سکتا۔

وہ یاس کا قائل نہیں ہاں ایک مسلسل کوشش کا ضرور قائل ہے۔ اسکے یہاں شک کا شائبہ ضرور ہے۔

"کس کو معلوم ہے کس وقت چلے آئیں وہ" میں اگر چہ ظاہراً طور پر ایک امید کی جھلک ہے لیکن اسکے پس پردہ ایک ابہامی کیفیت پنہاں ہے۔ یہ بھی بہت ممکن ہے وہ نہ بھی آئیں۔ کوئی وقت کا تعین نہیں، کوئی خاص وقت نہیں لیکن ہاں ایک رو تحت الشعور میں ضرور دوڑ رہی ہے، جو بار بار کہتی ہے۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ ضرور آئیں گے۔

ممکن ہے زندگی میں آگے چلکر ایسے مقامات آجاتے ہوں جہاں مایوسی امید میں بدل جاتی ہو۔ اور بہت ممکن ہے کہ روشن ان مقامات کو طے کر چکا ہو۔ ورنہ عموماً یہی دیکھا گیا ہے کہ

روز امید بدل جاتی ہے مایوسی میں۔

ادارہ

نئی کتابیں

انجمن ترقی اردو کی کہانی:۔ مولوی غلام ربانی صاحب سررشتۂ آثار قدیمہ کی لکھی ہوئی ہے۔ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ قیمت چار آنے

یہ کتاب انجمن کی ابتدائی حالت سے لیکر اسوقت تک کی جدوجہد اور کاوش کی ایک مختصر کہانی ہے۔ زبان نہایت عمدہ اور برجستہ ہے اور بہت مؤثر انداز میں لکھی گئی ہے۔ ہماری اکثر انجمنوں کی کیفیت ہے کہ پیدا ہوتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں اور بعض بعض تو اس خوبصورتی کے ساتھ پیدا ہوتی اور ختم ہو جاتی ہیں کہ لوگوں کو کانوں کان بھی خبر نہیں ہوتی بالکل اسی طرح سے جس طرح اسلام نے خیرات کا طریقہ بتایا ہے کہ اس طرح ہونی چاہئے کہ دائیں ہاتھ کی بائیں ہاتھ کو خبر نہ ہو۔

دراصل اس قسم کے تمام کاموں کی بنیاد کارکنان کے ذمہ دارانہ یا غیر ذمہ دارانہ رویہ پر ہوتی ہے۔ ہم لوگوں میں خلوص، ایثار، جانفشانی اور نیک نیتی سے کام کرنیوالے لوگ بہت کم ہیں۔ اکثر لوگ کسی انجمن یا اسی قسم کی کسی اور تحریک کی ذمہ داری محض اس وجہ سے قبول فرما لیتے ہیں کہ انکی نظر تحریک سے ہٹ کر ذاتی شہرت یا کسی ذاتی مفاد پر ہوتی ہے۔ ممکن ہے تحریک کی کامیابی بھی ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کامیابی ہو کیونکہ ذاتی مفاد تلاش کرنیوالے لوگ خود کام کرنے کے اہل نہیں ہوتے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تحریک جہاں سے شروع ہوئی تھی وہیں ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔

کسی تحریک میں کام کرنیوالے عموماً تین قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ پہلے وہ جو روپیہ صرف کرسکتے ہیں کام نہیں کرسکتے ایسے لوگوں کے پیش نظر محض شہرت اور ذاتی مفاد ہوتا ہے۔ دوسرے وہ جو کام کرسکتے ہیں روپیہ نہیں صرف کرسکتے۔ ایسے لوگ ضرورت سے زیادہ جوشیلے ہوتے ہیں اور تیسرے وہ جو روپیہ بھی صرف کرسکتے ہیں اور کام کرنیکی اہلیت بھی رکھتے ہیں لیکن یہ قسم عموماً نایاب ہے اور اگر ملتی ہے تو بہت مشکل سے۔ بعض اوقات اول الذکر قسم کے لوگوں کی نیت بھی درست ہوتی ہے مگر اتفاق سے جو کام انکے سپرد کیا جاتا ہے اس سے انکی طبیعت کو کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ کام بے دلی سے شروع ہوتا ہے نتیجہ یہ کہ سب کچھ صفر ہوکر رہ جاتا ہے جس کی قیمت دائیں یا بائیں کسی طرف لگانے سے بھی نہیں بڑھتی۔

یہ انجمن ترقی اردو کی خوش قسمتی ہے کہ اسے ایک ایسا آدمی مل گیا جو روپیہ بھی صرف کرسکتا ہے اور محنت بھی جان توڑ کر کرسکتا ہے یہ ہی اور کلی انجمن کی ترقی کا راز ہے۔ اس میں بڑا دخل نیک نیتی، خلوص اور ایثار کو ہے۔

•

مولوی غلام ربانی صاحب نے یہ رسالہ مولوی عبدالحق صاحب کی ۲۵ سالہ معتمدی انجمن ترقی اردو کی یادگار کے طور پر خود اپنے شوق سے تحریر کیا ہے اور جن جن مشکلات کا مولوی صاحب اور انجمن کو مقابلہ کرنا پڑا اسے نہایت اچھے پیرایہ میں بیان کیا ہے، کتاب کا آغاز انجمن کے ابتدائی دور سے کیا ہے کہ کیونکر مولانا شبلی، مولانا حبیب الرحمن شروانی کے ہاتھوں میں سے ہوتی ہوئی انجمن مولوی عبدالحق صاحب تک پہنچی۔ اسوقت انجمن کا کل سرمایہ مصنف کے الفاظ پر تھا۔

ایک پرانا صندوق جو بوسیدگی کی وجہ سے رسی سے کسا ہوا تھا، ایک رجسٹر اور چند پرانے اور غیر مرتب مسودات۔ ایک قلم دوات اور باقی اللہ کا نام،، اگر ہم آجکل کسی کو ایک لوہے کا گز۔ ایک گز گاڑھا اور ایک کاغذ کے پرزے پر شہر کے محلوں اور گلیوں کے نام لکھکر دیدیں اور کہیں کہ جاکر بڑے پیمانے پر تجارت کرو۔ تو سوائے اسکے کہ وہ شخص یا تو مسکرا کر خاموش ہوجائے یا پھر گالیاں دے اور کیا کرسکتا ہے مگر مولوی صاحب نے ایسا نہیں کیا۔ ممکن ہے اس ذمہ داری کو قبول کرتے وقت ان کے ہونٹوں پر ایک تبسم آگیا ہو مگر اس کے معنی بھی یہی تھے کہ اچھا۔

گر یہی رنگ تمنا ہے تو اب یونہی سہی

اس کے بعد انجمن کا کام شروع ہوا۔ اورنگ آباد دکن۔ ترقی اردو کی سرگرمیوں کا مرکز بنا اور وہ رقمیں جنہیں حقیر خیال کیا جاتا ہے جمع ہونی شروع ہوئیں جد وجہد ہوئی، دوڑ دھوپ کے ساتھ ساتھ خلوص کام کرنے لگا۔ چندہ اکٹھا کرنا بے انتہا مشکل کام ہے۔ مگر مولوی صاحب نے سب سے پہلے یہی کام کیا۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ بغیر روپے کے ہر سکیم چاہے وہ کتنی ہی مفید کیوں نہ ہو ناکام ہوکر رہ جاتی ہے۔ مختلف رسائل میں اسکی موافقت میں مضامین نکلنے شروع ہوئے۔ کیونکہ یہ دنیا پروپیگنڈے کی ہے اور اسکے بغیر کسی کام کو بڑے پیمانہ پر چلانا ذرا مشکل ہے۔ اب اس تمام جد وجہد کا نتیجہ یہ ہے کہ انجمن اب وہاں ہے۔ جہاں گمان بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کہ کبھی پہونچ سکے گی۔

ہماری زبان کا سرمایہ ابتک محض قصہ کہانیوں تک محدود تھا۔ اسے کسی صورت میں بھی علمی زبان نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک علمی اور ادبی زبان ہے۔ آجتک کوئی کتاب علم سائنس اور فلسفہ جیسے خشک مضامین سے متعلق ہماری زبان میں نہ تھی اور یوں بھی ہم لوگوں کے دماغ فطرتاً تعیش پسند ہیں۔ ہمارا ہر ادنی آدمی اس دور کے خواب دیکھتا ہے جب اس کا رنگین تخیل حقیقت میں بدل جائیگا اور بقول شخصے اسکے لئے۔

دن عید اور رات شب برات ہوگی۔

لیکن انجمن ترقی اردو کی کوششوں سے تصنیف وتالیف اور ترجمہ کی طرف قدم اٹھایا گیا اور آج اس زبان میں بہت سی کتابیں فلسفہ، تاریخ اور سائنس سے متعلق مل سکتی ہیں یہاں تک کہ ابتدائی جماعتوں کی درسی کتابیں بھی جن کا اس وقت تک قحط تھا

اس وقت انجمن سے دو ٹھوس رسالے، اردو، اور سائنس نکل رہے ہیں اور انکی اہمیت کسی بھی صاحب علم سے پوشیدہ نہیں۔

غرضیکہ تمام کتاب انجمن اور مولوی صاحب کی کاوشوں اور مشکلوں کے ساتھ ساتھ اسکی ترقیوں کی بھی ایک مختصر روداد ہے، اخیر میں انجمن کی چند مفید کتابیں مثلاً میکسم گورکی کی خود نوشت سوانح عمری قاضی نذرالاسلام کی بنگالی نظموں کا ترجمہ پروفیسر براؤن کی تاریخ ادبیات ایران اور نتشے کی تصنیف بقول زرتشت کا ترجمہ وغیرہ وغیرہ

کی فہرست درج ہے۔ انجمن اور اردو زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کیلئے ایک اچھی چیز ہے۔ چاہئیے کہ لوگ اسے زیادہ سے زیادہ تعداد میں خریدلیں۔

انشائے داغ۔ مرتبہ سید علی احسن صاحب احسن مارہروی۔ شائع کردہ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی۔ قیمت ایک روپیہ چھ آنے

یہ مرزا داغ دہلوی کے خطوط کا مجموعہ ہے جس میں پہلی فصل میں والیانِ ریاست، حکام، عمال اور امراء کے نام خطوط ہیں۔ دوسری فصل میں مخصوص اعزہ واحباب اور تلامذہ کے نام خطوط ہیں۔ تیسری فصل میں بسلسلۂ شاعری شاگردوں کے نام خطوط ہیں۔ مقدمہ سے پہلے احسن مرحوم کی بہت عمدہ تصویر ہے اور مقدمہ کے بعد مرزا داغ کی تصویر ہے داغ صاحب اس تصویر میں شاعر اور غوجی زبان معلوم ہوتے ہیں۔ بہرحال خیالات واحساسات کی تنظیم بھی عسکری تنظیم سے کچھ کم نہیں۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ لوگوں کو ہندوستان میں اپنے مشاہیر کے خطوط سے دلچسپی ہوگئی ہے۔ دراصل خطوط ہی ایسی چیز ہیں جن سے کسی شخص کی انفرادیت اور اخلاق زندگی کی عکس کشی ہوتی ہے۔ کسی بھی زبان میں کیوں نہ ہوں خطوط کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوتی۔

اکثر ایسا ہوا ہے کہ ادبی شخصیتیں دماغی خلجان اور خلفشار میں مبتلا رہی ہیں۔ ایسا بہت کم ہوا ہے کہ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنے ادبی کاموں میں مصروف رہتے ہوں۔ اور اس ذہنی کشمکش نے انہیں بارہا مجبور کیا کہ اپنی ان تلخیوں اور مجبوریوں کی داستان کسی کو سنائیں تاکہ کچھ بوجھ ہلکا ہو جائے۔

ہر شخص کی زندگی کے عموماً دو رخ ہوا کرتے ہیں ایک وہ جو عوام کے سامنے پیش ہوتا ہے اور دوسرا وہ جو کبھی عوام کے سامنے نہیں آتا۔ اس دنیا میں ہر شخص اپنے منہ پر ایک نقاب ڈالے پھرتا ہے۔ ہمارے گرد وپیش جس قدر بھی چہرے ہیں ان میں بہت کم اپنے اصلی روپ میں ہوتے ہیں بلکہ اپنے اصلی روپ میں کبھی ہوتے ہی نہیں۔ ہماری اس دنیا کا رویہ کاروباری قسم کا رہا ہے اور ہر ایک کاروبار کے لئے کچھ خاص قسم کی عادتوں اور مہارتوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ ہم میں سے جو لوگ وہ مہارتیں حاصل کر لیتے ہیں وہ لوگ کامیاب زندگی بسر کرتے ہیں۔ اور جو وہ عادتیں اور مہارتیں جن کی قدم قدم پر ضرورت ہے حاصل نہیں کر سکتے وہ اس زندگی کی دوڑ میں کچلے جاتے ہیں۔ اگرچہ ایک عرصہ سے جب سے انسان کی شعوری کیفیتیں اجاگر ہوئی ہیں اخلاقیات کے اصول مرتب ہو چکے ہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ وہ آجتک اصولوں ہی کی حد تک ہیں اس سے زیادہ ان کی کوئی وقعت نہیں۔

کسی انسان کو جبتک وہ اپنے منہ پر سے نقاب نہ اتار کر پہچاننا بہت مشکل کام ہے اور بہت مشکل ہے کہ آدمی منظرِ عام پر آکر اپنے چہرے سے وہ نقاب الٹ دے جس نے اسے عزت یا ذلت جو کچھ دی ہو، لیکن ایسا ہونا ضرور ہے کہ آدمی اپنے چہرے سے نقاب الٹتا ہے اور وہ صرف تنہائی ہے جس میں آدمی بالکل بے نقاب ہوتا ہے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ ہر آدمی کا کوئی محرم راز ہو۔ آدمی اپنے محرم راز کے سامنے اپنا سینہ کھول کر رکھ دیتا ہے۔ اپنے چہرے سے نقاب الٹ کر پھینک دیتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات تو بالکل عریاں ہو جاتا ہے۔ اس عریانی کا پتہ لگانے کا بھی کوئی طریقہ اس وقت معلوم نہ تھا۔ مگر اب معلوم ہو گیا ہے۔ اور وہ کسی انسان کے خطوط ہیں جو اس نے کسی محرم راز کو لکھے ہوں۔

خطوط انسان کی زندگی کے آئینہ دار ہیں۔ غالباً اگر نیپولین کے خطوط جو اس نے مختلف عورتوں سے عشق کے دوران میں لکھے نہ ملتے تو کوئی بھی اسکی اخلاقی زندگی کا پتہ نہ لگا سکتا۔ اس طرح اگر کوئی جج اپنے روزانہ کے انصاف کی حقیقت اپنے کسی محبوب کو لکھ کر بھیجنا شروع کر دے تو ظاہر ہے کہ وہ اس کی زندگی کے آئینہ دار ہوں گے کوئی بھی اس خیال سے خطوط نہیں لکھتا کہ یہ کبھی منظرِ عام پر آئیں گے اس میں وہ جو چاہتا ہے نہیں بلکہ جو اسکی زندگی ہوتی ہے وہ خطوط میں نمایاں کر دیتا ہے جس طرح ایک مصور تصویر کھینچتے وقت اپنے سامنے رکھی ہوئی چیز کے غیر نمایاں حصہ تک نہیں چھوڑتا۔ اس لئے لکھنے والا اپنی زندگی کے غیر نمایاں پہلو خط میں لکھے بغیر باز نہیں رہ سکتا۔

بہرکیف، کتاب میں اس کے سوا کوئی جاذبیت نہیں کہ داغ کے خطوط ہیں اور ایسی چیزیں اگر پاس رہیں تو کوئی برائی نہیں۔ تاکہ اپنے مشاہیر کی اخلاقی زندگی کا بھی علم ہو جائے۔

(ادارہ)